جلد ۷۰ جولائی ۱۹۶۹ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زرسالانہ: سات روپے فی پرچہ: ۵۰ پیسے

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۱	جولائی ۱۹۶۹ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ	عدد ۵

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵ - اے ۔ ذیلدار پارک ۔ اچھرہ ۔ لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن، اچھرہ
لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

دنیا میں آج تک جتنی بھی مادی تہذیبیں اُبھری ہیں ان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں دوسری بہت سی خصوصیات کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان میں انسان ایسے کارنامے انجام دینے کے پیچھے پڑا رہتا ہے جن میں سنسنی خیزی اور نمائش کا رنگ غالب ہو۔ اور اُن امور کی طرف بہت کم توجہ دیتا ہے جو اگرچہ اس کے لیے ازحد ضروری ہیں مگر جن سے فضا میں ہلچل پیدا نہیں کی جا سکتی۔ یہ جوہری بم کے دھماکے، یہ برق رفتار طیارے اور اب چاند پر جانے کے منصوبے سب اسی مادی تہذیب کے نمائشی پہلو ہیں۔

ہماری اس گزارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات یا علم و فن کی ترقی کسی اہمیت کی حامل نہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ مادی تہذیب کی آغوش میں پرورش پانے والا انسان ان اُمور کی طرف متوجہ نہیں ہوتا جن سے انسان کی روح کو سکون حاصل ہو اور اس کی انسانیت کو جلا ملے۔ بلکہ وہ اپنی ساری فکری اور عملی قوتیں ایسے کاموں میں کھپاتا ہے جن سے حالات کے اندر تلاطم پیدا ہو اور ہر شخص انہیں دیکھ کر ششدر رہ جائے۔

آپ اگر گذشتہ دو سو سال کے واقعات پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو اس امر کی پوری تصدیق ہو گی کہ انسان نے بھاپ کے دیو کو مسخر کر کے اس سے اس غرض کے تحت کام لینا شروع کیا تاکہ پیدائش دولت میں غیر معمولی اضافہ ہو۔ اضافہ تو بلاشبہ ہوا مگر انسان کو اس اضافے سے کیا حاصل ہوا؟ وسیع پیمانے پر بیروزگاری، مزدور کی آزادی کا خاتمہ، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، طبقاتی کشمکش، استعماریت کی ستم رانی، خاندانی نظام کی بربادی، اخلاقی اقدار کی پامالی اور جرائم کی زیادتی۔ اگر کثیر پیداواری اور زود پیداواری کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو بحیثیت مجموعی فائدہ حاصل ہو تو کوئی صاحب بصیرت بھی موجودہ حالات کو دیکھ کر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مادی تہذیب اپنے اس

مقصد میں کامیاب ہوئی ہے۔

جدید انسان نے حمل و نقل اور پیغام رسانی کے ذرائع کو نہایت ہی بہتر بنایا ظاہر بات ہے کہ اس کی یہ کوشش نیک غرض کے لیے ہی تھی۔ اس تگ و دو کے پیچھے اس کے سامنے یہ مقصد ہی کارفرما ہوگا کہ انسان اور انسان کے درمیان جو زمینی فاصلے حائل ہیں وہ کم ہوں اور سارے انسان ایک دوسرے کے قریب ہوکر سکون اور آرام سے زندگی بسر کریں۔ مگر عام واقعات میں اس سعی و جہد کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ انتہائی تشویشناک ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان اخوت کے رشتے قائم ہونے کے بجائے نفرت اور حقارت پیدا ہوئی اور انسانیت ایک وسیع برادری کی حیثیت سے زندہ رہنے کے بجائے مختلف دھڑے بندیوں کا شکار ہوکر رہ گئی۔ گروہی اور نسلی تعصبات نے انسانی اخوت کے پاکیزہ جذبات کو ختم کرکے رکھ دیا اور انسان جسمانی طور پر ایک دوسرے کے نہایت قریب ہونے کے باوجود ذہنی اور جذباتی اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت دور ہوگئے۔ نوع بشری کے افراد نے ایک دوسرے کی معاونت اور دستگیری کرنے کے بجائے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا اپنی زندگی کا اہم مقصد قرار دیا۔ دنیا کی مختلف قوموں اور نسلوں کے درمیان آج جو عداوت اور دشمنی پائی جاتی ہے اسے دیکھتے ہوئے کیا کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی باور کرسکتا ہے کہ دنیا کے سارے انسان ایک باپ کی اولاد ہیں۔ ان کی ایک دوسرے کے خلاف نفرت کو دیکھ کر تو یوں احساس ہوتا ہے کہ ان قوموں اور نسلوں کا خمیر ہی انسان دشمنی سے اٹھایا گیا ہے اور انہوں نے یہ طے کر رکھا ہے جب تک وہ ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹا نہ لیں اس وقت تک انہیں چین نصیب نہیں ہوسکتا۔ فاصلوں میں کمی اور تباہ کن آلات کی ایجاد نے انسان دشمنی کے اس جذبے کو انتہائی تشویشناک بنا دیا ہے۔ پہلے انسان کو اس منفی جذبہ کی تسکین کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی تھی مگر اب یہ حال ہے کہ وہ اپنے دائیں بائیں جھانک کر جس قوم اور جس ملک کو چاہتا ہے چشم زدن میں برباد کرکے رکھ دیتا ہے۔ آخر زمین کے گوشے سمٹنے سے انسان کو کیا حاصل ہوا؟ کاش کہ موجودہ دور کا انسان اس پر سنجیدگی سے غور کرے۔

انسان نے پانی کی یلغار کو روک کر اس سے بجلی پیدا کی، فضاؤں میں اڑ کر اپنی بالادستی کو تسلیم کروایا۔ انسان کے یہ کارنامے واقعی حیران کن ہیں۔ پانی کی بپھری ہوئی قوت سرنگوں کی گئی اور دیو ہیکل مشینری متحرک کرنے میں استعمال کی جانے لگی۔ آسائشات زندگی میں اضافہ ہوا۔ مگران مشینوں نے احساسِ مروت کو بالکل کچل کر رکھ دیا۔ کارخانہ داروں نے انسان کو انسان سمجھنے کے بجائے اسے مشین کا بالکل بے حس پرزہ سمجھ کر اس سے معاملہ کیا۔ اس کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا کہ وہ ہر قسم کے لطیف جذبات سے عاری ہے۔ وہ اپنے اندر کوئی ضمیر نہیں رکھتا، وہ عزتِ نفس کے احساس سے یکسر محروم ہے۔ وہ لوہے کی مشین کی طرح گوشت پوست کی محض ایک مشین ہے۔ جس پر کم سے کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ کام لینا چاہیے کیونکہ یہ انسانی مشینیں تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں اس بنا پر انہیں معمولی رقم کے بدلے بڑی آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اس نظریے کے مطابق انسان کی قدر و قیمت مشین کی طرح اس کی پیداواری قوت کی نسبت سے متعین کی جانے لگی۔ اگر پیداواری قوت زیادہ ہوئی تو منڈی میں اس کی قیمت زیادہ پڑی، لیکن اگر یہ قوت کم ہوئی تو اس کی قیمت میں اچھی خاصی کمی ہو گئی۔ کسی انسان نے یہ نہ سوچا کہ آخر اس ذی روح اور صاحبِ ارادہ ہستی کو مشین کی سطح پر رکھ کر اس کے ساتھ کیسے انصاف کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے پر کسی نے غور کرنا گوارا نہ کیا بلکہ انسان کے ساتھ مشین کی طرح کا سلوک کرنے پر اصرار کیا۔ کیونکہ اب کسی چیز کی افادیت کا معیار ہی سرمایہ کی فراہمی ٹھہرا۔ اس لیے مشین اور انسان دونوں میں سے جو بھی پیدائشِ دولت کے اعتبار سے زیادہ مستعد ثابت ہوا اسے ہی زیادہ مفید خیال کیا گیا۔ تجربے اور مشاہدے نے اس امر کا فیصلہ کر دیا کہ مشین انسان کی نسبت زیادہ سرمایہ فراہم کر سکتی ہے۔ چنانچہ بے جان مشینوں کے لیے تو ہر قسم کے تحفظات کا انتظام کیا گیا۔ مگر "اشرف المخلوقات" کو حوادث کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

اس اندوہناک صورتِ حال پر کچھ لوگوں نے آنسو بہائے۔ بعض ادیبوں نے افسانوں اور کہانیوں میں اس کا بڑے کرب و اضطراب کے ساتھ تذکرہ بھی کیا۔ مختلف ماہرینِ فن نے فنی مہارت کے ساتھ اس کا جائزہ لیا۔ مگر اس افسوسناک حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ سارے مفکرین اس نتیجے پر پہنچے کہ انسان مشین سے جڑ گیا

سمجھا گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو مشین ثابت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ قدرت نے اسے ایک خودکار مشین بنایا تھا مگر اس کی حماقت دیکھیئے کہ اس نے خواہ مخواہ اپنے دل و دماغ کے اندر بعض مذہبی معتقدات پال کر اور اخلاقی اور روحانی احساسات کو پرورش کر کے غیر مشینی روش اختیار کر لی نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ صحیح معنوں میں ایک بے حس مشین بننے میں ناکام رہا اور اس بنا پر لوہے کی مشین کے مقابلے میں اسے شکست کھانا پڑی ان میں سے ایک مفکر نے اسے یہ بتایا کہ وہ غلطی سے اپنے آپ کو کسی ارفع و اعلیٰ ذات کا اس زمین پر خلیفہ سمجھ رہا ہے۔ درانحالیکہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے محض ایک حیوان ہے اور حیوان ہی سے اس نے چند ارتقائی منازل طے کر کے موجودہ شکل و صورت اختیار کی ہے۔ اس بنا پر اس کی حقیقی احتیاج مذہب و اخلاق نہیں بلکہ حیوانی ضروریات ہیں اسے پیٹ بھر کر کھانا اور صنفی جبلت کی تسکین کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل اور آزادی چاہیئے۔ اخلاق اور روحانیت کی سب باتیں غیر فطری ہیں جو اس کے مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں بلکہ اس کے فطری طرز عمل میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں۔

مغرب کے انسان نے اس عجیب و غریب نظریے سے نہایت گہرا اثر قبول کیا اور جلد ہی یہ باور کر لیا کہ وہ واقعی حیوان ہے اور یہ مذہب، اخلاق اور روحانیت سب بیکار باتیں ہیں۔ انسان پر جس وقت اپنی حیوانیت کا راز کھلا تو پھر اس نے اپنے عمل کے محرکات کا از سر نو جائزہ لینا شروع کیا اور تحقیق کے ایسے نوادر پیش کیے کہ عقلِ سلیم سر پیٹ کر رہ گئی۔ اس نے انسان کو یہ باور کرایا کہ عمل کا اصل محرک ایک ہی ہے اور وہ بھوک ہے جو دو صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ پیٹ یا صنفی خواہش ان مفکرین نے انسان کو اس بات کا یقین دلایا کہ انسانی افکار و اعمال کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی تہ میں یہی ایک جبلت دو صورتوں میں نظر آئے گی۔ اس نظریہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بڑے بڑے عجیب و غریب فلسفے گھڑے گئے اور بڑے عجیب و غریب نوعیت کے دلائل فراہم کیے گئے۔ دنیا کی نہایت اونچی مذہبی اور روحانی شخصیتیں، جن کی مقدس زندگیاں اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ انسانی عمل کا بنیادی محرک حیوانی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ کیونکہ اسے اخلاقی احساس کے ساتھ اس کرہ ارضی پر اتارا گیا ہے۔ بڑی بے دردی کے ساتھ زیر بحث لائی گئیں اور ان کے مقدس افعال و اعمال کو توڑ موڑ کر اس

طرح پیش کیا گیا جس سے ان کے باطل افکار کی تصدیق ہو سکے۔ ان مغربی مفکرین کو حقیقت اور سچائی کی تلاش نہ تھی بلکہ کسی طرح لوگوں کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ انسان نے حیوانیت کے مرتبہ سے بلند ہو کر نہ کبھی سوچا ہے اور نہ عمل کیا ہے اور انسان کے وہ افکار و اعمال جنہیں وہ اخلاقی اور روحانی کہتا ہے وہ درحقیقت حیوانی محرکات کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔

فکر و نظر کی یہ تبدیلی بڑی انقلاب انگیز تھی۔ اس نے اخلاق و شرافت کی ساری اقدار کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا اور انسان اس نہج پر سوچنے لگا کہ ضبطِ نفس کی وہ تعلیم جو اس نے مذہب سے حاصل کی تھی اور جسے وہ انسانیت کا جوہر سمجھتا تھا وہ تو درحقیقت اس کے نفس کے اندر اس کی شخصیت کے خلاف ایک خوفناک سازش ہے۔ چنانچہ اس نے مذہب، اس کے علمبرداروں اور اس کی تعلیمات کو بے وزن بنانے کے لیے بڑی شرمناک مہم شروع کی اور اپنے کام کا آغاز اس ارادے کے ساتھ کیا کہ انسان جب تک پوری طرح حیوان نہیں بن جاتا اس وقت تک وہ دم نہ لے گا۔

کسی معاشرے کے افراد کا مذہب پر ایمان رکھنے اور ضبط نفس کو انسانی زندگی کے لیے ضروری سمجھنے کے باوجود کسی وقت خواہشِ نفس سے مغلوب ہو کر کوئی بات کر لینا اور چیز ہے مگر مذہب کو انسان کا دشمن سمجھ کر اور ضبطِ نفس کو بیکار کی زنجیریں اور انسانی شخصیت کی ترقی کی راہ کا سنگِ گراں سمجھ کر، اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا دوسری چیز ہے۔ حیوانیت کو زندگی کی اصل سمجھنے سے پہلے بھی انسان حیوانی سطح پر اُتر کر بعض حرکات کر لیتے تھے۔ مگر انہوں نے کبھی بھی اس سطح کو معیارِ مطلوب قرار نہیں دیا۔ انسان نے اسے ہمیشہ انسانیت کے ارفع و اعلیٰ مقام سے فروتر ہی خیال کیا مگر اس جدید انقلاب نے پوری زندگی کی بساط ہی اُلٹ کر رکھ دی اور انسان نے پورے شعور اور تدبّر کے ساتھ حیوانیت کو زندگی کا حقیقی جوہر قرار دے کر اپنے آپ کو حیوان بنانے کی کوشش کی۔

جس انسان کے اندر عقل اور شعور کی شمعیں روشن ہوں۔ جس کی فطرت کے اندر وجدان اور اخلاقی احساس موجود ہو۔ جس نے صدیوں تک تہذیب نفس کے لیے مسلسل جدوجہد کی ہو۔ اُسے ان سارے فطری اوصاف سے محروم کر کے حیوانِ محض بنا دینا کوئی آسان کام نہیں۔ یورپ میں جب حیوانیت کی یہ تحریک شروع ہوئی تو اسے پہلے پہل توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ کیونکہ مسیحی پادریوں نے مذہب کے نام پر جو [illegible] اور انسانیت کش پابندیاں عائد کر رکھی تھیں ان کے خلاف عوام کو بغاوت کا نہایت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا، مگر بدقسمتی سے وہ اس معاملے میں توازن قائم نہ رکھ سکے اور انہوں نے ہر اُس چیز کی شدت سے مخالفت شروع کی جس کا کوئی تعلق بھی مذہب سے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق، شرافت، پاکیزہ جذبات اور روحانی احساسات سب کو مذہب دشمنی کا یہ دھارا اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔

جو جذبہ اور احساس انسانی فطرت کے اندر پوری طرح جاگزیں ہو، بلکہ جو اس میں بنیادی عنصر کے طور پر شامل ہو۔ اسے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنا کوئی کھیل نہیں۔ اس مشکل ترین کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے انسانی فطرت کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں کی یوں تو متعدد صورتیں اور بے شمار رُخ ہیں۔ مگر ان میں دو سب سے نمایاں ہیں۔ گوشت پوست کے انسان کے اندر جذبہ و احساس کا جو روحانی انسان بیٹھا ہوا ہے اس کے یا تو وجود کی نفی کی گئی یا اس کے بارے میں یہ تاثر قائم کیا گیا کہ وہ ایک لاش ہے جسے مذہبی گھٹن کی فضا نے متعفن کر دیا ہے۔ انسان اگر بہتر اور شادکام زندگی بسر کرنے کا متمنی ہے تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خارجی زندگی میں کوئی خوش آئند تبدیلی پیدا کرے۔ اس تبدیلی سے ان حضرات کی مراد مادی حالات کے اندر تبدیلی ہے۔ یعنی انسان کو مادی دولت کی زیادہ سے زیادہ مقدار میسر آئے۔ انسان کی توجہ کو داخل سے ہٹا کر خارج میں لگانے کے لیے علم طبیعیات کی اہمیت کو غیر معمولی حد تک بڑھایا گیا اور اسے یہ باور کرایا گیا کہ انسان کی اصل کامیابی یہی ہے کہ وہ عالم طبیعات میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کرے اور اسے ہی کل کائنات خیال کرے۔

آفاق پر غور و فکر کو مذہب نے بھی اچھی خاصی اہمیت دی ہے اور اس کے شعور کو بیدار کرتے ہوئے اسے اس بات پر متوجہ کیا ہے کہ وہ آفاق میں پھیلی ہوئی آیاتِ الٰہی پر غور کر کے اللہ پر ایمان اور یقین کو مستحکم کرے کیونکہ جب تک اس کا خالقِ کائنات پر ایمان مستحکم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ آفاق کی قدر و قیمت کو پوری طرح پہچان نہیں سکتا۔ مذہبی اندازِ فکر کے مطابق آفاق کی نشانیاں حقیقتِ کبریٰ کی عظمت کو پہچاننے کا محض ایک ذریعہ ہیں مگر مادی تہذیب کے پرستار نے خالقِ کائنات کے وجود پر ان محسوس شواہد کو ہی حقیقتِ کبریٰ سمجھ لیا اور اس امر کا یقین کر لیا کہ جو شے بھی حواس کی گرفت میں نہیں آسکتی یا جو مادی نقطۂ نظر سے کسی اہمیت کی حامل نہیں ہو سکتی وہ محض ایک خیالِ خام ہے۔ اس طرح خدا، آخرت، حشر و نشر، جنت، دوزخ، وحی، ضمیر، وجدان، روح اور اخلاقی احساس سب کی سرے سے نفی کر دی گئی۔

ان لوگوں کو اپنی بالغ نظری کا بڑا ادعا تھا مگر عملاً ان کا حال یہ تھا کہ تعصب اور تنگ نظری کے شکار ہونے کی وجہ سے انسانیت کے یہ کرم فرما نفس کے ان بدیہی حقائق کو جان بوجھ کر نظر انداز کرتے رہے جو آفاق سے کہیں زیادہ ان کے قریب تھے وہ عالمِ طبیعیات کے طلسمات میں کھو کر رہ گئے مگر انہوں نے اس وسیع و عریض عالم کی طرف قطعاً توجہ نہ دی جس میں ان کی انسانیت کا جوہر موجود ہے۔ اور اگر انسانی روح کبھی اس طرف توجہ کرنے پر مجبور بھی ہوئی تو اُسے یہی کہہ کر ورغلایا گیا کہ جس عالم کو تم عالمِ روحانیت کہتے ہو وہ درحقیقت خارجی حالات کا بگڑا ہوا عکس ہے۔ اس لیے تمہیں باطن کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے خارجی حالات کی طرف پُوری توجہ دینا چاہیے۔ یہ ہے وہ غلط اندازِ فکر جس سے انسانی زندگی روحانی احساس سے آہستہ آہستہ عاری ہوتی گئی۔

انسان اس احساس سے دفعتہً محروم نہ ہُوا۔ اور نہ کبھی ہو سکتا ہے بلکہ روحانی اور اخلاقی احساس کو کمزور کر کے اسے حیوان بنانے میں اچھی خاصی مدت صرف ہوئی۔ اس ساری مدت میں انسان روحانی احساسات کی قدر و قیمت گھٹاتا رہا اور حیوانی جذبات کی اہمیت غیر معمولی حد تک بڑھاتا رہا۔ مگر کچھ وقت تک یہ دونوں

جذبات ایک دوسرے کے ساتھ موجود رہے لیکن جس انداز پر نئی تہذیب کو اٹھایا جا رہا تھا اس میں ناگزیر تھا کہ روحانی احساسات بالکل مضمحل ہو کر رہ جائیں اور ان کے مقابلے میں حیوانیت کی مکمل طور پر عملداری قائم ہو۔ مگر اس تبدیلی نے بعض عجیب و غریب پیچیدگیاں پیدا کیں۔ روحانی اور اخلاقی احساس کے کمزور پڑھنے کی وجہ سے انسان کو اس بات کی ضرورت محسوس ہونے لگی کہ انسان کو خارجی زندگی کے جھمیلوں میں اس طرح الجھا دیا کہ اس کے اندر یہ احساس ابھرنے نہ پائے کہ اس کی صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ دورِ جدید کے معاشرتی اور معاشی نظام کا اگر سرسری سا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج جو فکر ان پر سب سے زیادہ مسلط نظر آتی ہے وہ فکر معاش ہے۔ جس انسان کو بھی دیکھیے اس کے لیے معاش کا مسئلہ دردِ سر بنا ہوا ہے۔ اس مسئلے میں انسان کو جان بوجھ کر اس لیے الجھایا گیا ہے تاکہ فکر معاد اسے کسی طرح اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے۔

جدید انسان معاشی الجھنوں ہی میں گرفتار نہیں بلکہ سیاسی اور معاشرتی پیچیدگیاں بھی ہر وقت اس کے لیے دردِ سر بنی رہتی ہیں اور وہ بیچارا انہیں حل کرنے ہی میں عمر عزیز صرف کر دیتا ہے مگر اسے معمولی کامیابی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ آپ مثال کے طور پر انصاف کو ہی لیں۔ کسی معاشرے میں انصاف کا حصول چونکہ ہر فرد کی بنیادی ضرورت ہے اس لیے اسے ہوا اور پانی کی طرح ارزاں اور اس کا طریق کار سورج سے زیادہ واضح اور روشن ہونا چاہیئے تاکہ یہ ہر فرد کو باسانی میسر آ سکے۔ مگر اس وقت صورت حال یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی اس بنیادی ضرورت کے حصول کے لیے انسان کو بہت زیادہ روپیہ اور محنت صرف کرنی پڑتی ہے اور بڑے صبر آزما مراحل سے گذرنے کے بعد میزان عدل تک اس کی رسائی ہوتی ہے پھر اس میزان کا نظام اتنا پرپیچ ہوتا ہے کہ ایک عام انسان اس کے ابتدائی طریق کار کو بھی سمجھنے سے قاصر رہتا ہے اور وہ جب تک کسی ماہر فن کی خدمات حاصل نہ کر لے اس وقت تک وہ عدالت کی بارگاہ میں حاضری کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہی پیچیدگیاں انتظامیہ میں بھی ہر مرحلے پر پیش آتی ہیں۔ انتظامیہ کی اصل غرض تو اسی قدر ہے کہ وہ کسی معاشرے کے اندر رہنے والے افراد کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے تاکہ لوگ

اطمینان اور سکون سے زندگی بسر کر سکیں مگر مادی نظام نے اس کے طریق کار کو اتنا پیچیدہ بنا دیا ہے کہ کسی فرد کو اپنے اس انسانی بنیادی حق کے حاصل کرنے کے لیے اتنی کڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے کہ اُسے زندگی کے دوسرے مسائل یکسر بھول جاتے ہیں۔

اندر کے انسان سے یہ اغماض اور صرف نظر اور خارجی زندگی اور اس کے معاملات سے یہ غیر معمولی وابستگی بلکہ انہماک اس اندازِ فکر کا بالکل قدرتی نتیجہ ہے جسے مادی تہذیب نے جنم دیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ انسان جب عالم باطن سے اپنی توجہ ہٹا لیتا ہے تو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو کسی راہ پر لگانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُسے خارجی دنیا کے جھمیلوں میں پھنسا دیا جائے تاکہ وہ مصروف رہے۔

سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کے خارزار کے علاوہ ایک اور میدان جس میں الجھا کر انسان کو روحانی اور مذہبی احساسات کی عظیم دولت سے بیگانہ رکھا جاتا ہے وہ سائنسی اور فنی تحقیقات ہیں۔ ہمیں ان تحقیقات کی اہمیت سے انکار نہیں۔ ان سے علم کے افق وسیع تر ہوئے ہیں۔ مگر چونکہ یہ تحقیقات اخلاقی اور روحانی احساس سے یکسر بے تعلق ہوتی ہیں۔ اس لیے ان سے جو قوت بھی ہاتھ آتی ہے اس کا بیشتر حصہ بیکار کاموں بلکہ تباہ کن کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ آپ جوہری توانائی کو ہی دیکھیے اس کی دریافت سے انسان کے ہاتھ میں کس قدر غیر معمولی قوت آئی ہے۔ مگر آج اسے انسان اپنے بھائیوں کی وسیع پیمانے پر ہلاکت اور بربادی کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ دنیا کی مختلف قومیں کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے اسے بنانے پر صرف کر رہی ہیں مگر اس سے ان کی سب سے اہم غرض یہی ہے کہ اس کی مدد سے دوسری اقوام کو غلام بنایا جائے۔ ان کے وسائل پر قبضہ کیا جائے اور اگر کوئی قوم اس راہ میں مزاحم ہو تو اسے چشم زدن میں ملیامیٹ کر دیا جائے۔

انسان کو زندگی کے خارجی طلسمات میں مستقل طور پر گرفتار رکھنے کے لیے اہل یورپ اس بات کا برابر التزام کرتے رہتے ہیں کہ عوام کے سامنے بغیر کسی وقفہ کے عالم طبیعات کے نہایت سنسنی خیز پہلو آتے

رہیں تاکہ ان کی توجہ کسی دوسری طرف مبذول نہ ہونے پائے ۔ ان دنوں چاند پر انسان کو اتارنے کی تیاریاں اور ان کے چرچے سب اسی ذہنیت کے مظاہر ہیں ۔ آج انسان جس دنیا میں آباد ہے وہ اس کے لیے دوزخ بنی ہوئی ہے ۔ بے شمار لاینحل مسائل ایسے ہیں جو حل کے لیے اس کی توجہ اور ناخن تدبیر کے محتاج ہیں ۔ مگر چونکہ ان کی طرف متوجہ ہونے اور انہیں کسی حد تک حل کر لینے سے سنسنی خیزی پیدا نہیں ہو سکتی اس لیے انہیں جوں کا توں چھوڑ کر چاند پر پہنچنے کے لیے سر توڑ کوششیں کی جا رہی ہیں ۔ یہاں ان سب مسائل کا تذکرہ طوالت کا باعث ہو گا ۔ ہم صرف چند اہم مسائل کا ذکر کرتے ہیں ۔

اگر روحانی مسائل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اس وقت دنیا کا سب سے اہم مسئلہ اخلاقی بگاڑ ہے ۔ دنیائے مشرق کو تو جانے دیجئے کہ یہ کرہ ارض کا غیر مہذب حصہ ہے خود مغربی تہذیب کے گہوارے میں جرائم کی رفتار اس قدر زیادہ ہے کہ لوگ چیخ اٹھے ہیں ۔ قتل و غارت ڈاکہ ، اغوا ، زنا ، چوری اور لوٹ کھسوٹ فریب دہی یہ وہ عام جرائم ہیں جن میں بڑی تشویشناک رفتار کے ساتھ اضافہ ہو رہا ہے ۔ چند ماہ ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ میں امریکہ کے سابق صدر آیزن ہاور کا اس موضوع پر ایک فکر انگیز مضمون شائع ہوا تھا جس میں اس نے ان جرائم کی ہر آن بڑھتی ہوئی رفتار پر بڑے کرب و اضطراب سے اظہار خیال کیا اور اس امر کا اعتراف کیا کہ اخلاقی بندھن نہ ہونے کی وجہ سے انسان بالکل بے لگام ہوتا جا رہا ہے ۔ اس ضمن میں اس نے قانون اور انتظامیہ کی بے بسی کا بھی بڑے دردناک الفاظ میں تذکرہ کیا ۔

یہ اندوہناک صورت حال صرف امریکہ ہی میں نہیں ، برطانیہ ، فرانس ، جرمنی اور دوسرے مہذب ممالک بھی اس مصیبت کا شکار ہیں ۔ خصوصاً نوجوان نسلیں تو اس قدر بے قابو ہوتی جا رہی ہیں کہ مغرب کے بعض مفکرین بے اختیار ہو کر یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ کیا انسان تباہی سے بچ بھی سکے گا یا نہیں ۔ جن ممالک میں ایک منٹ میں قتل کی ایک واردات ہو ۔ ایک منٹ میں ڈاکہ پڑے اور ایک منٹ میں اغوا جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا جائے وہاں لوگوں کے اندر جان و مال کے تحفظ کے بارے میں کیا احساس ہوتا ہو گا ۔

یہ مسئلہ زندگی کا کوئی ثانوی مسئلہ نہیں جسے وقتی طور پر پس پشت ڈالا جا سکے ۔ جب کسی معاشرے میں

انسان کی جان اور اس کی عزت و آبرو ہی محفوظ نہ ہو تو وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے دل و دماغ پر ہر وقت خوف و ہراس طاری رہتا ہے جو اس کے اندر لاتعداد ذہنی عوارض پیدا کرتا ہے۔ دورِ جدید میں انسان کی معاشرتی زندگی کے اندر جو اختلال پیدا ہوا ہے اور خود اس کے اعصاب پر جو غیر معمولی بوجھ پڑا ہے اس کی ایک بڑی وجہ عدم تحفظ کا یہی احساس ہے۔

ان جرائم کے علاوہ لاتعداد مسائل ابھی ایسے ہیں جو انسانی توجہ کے محتاج ہیں۔ بھوک، بیماری، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، انفعالیت الغرض اس نوعیت کی لاکھوں محرومیاں اور ستم رانیاں انسان کا مقدر بن چکی ہیں۔ معاشی منصوبہ بندیوں کے اس دور میں دنیا میں کروڑوں نہیں اربوں انسان ایسے ہیں جنہیں زندگی کی بنیادی ضروریات تک میسر نہیں۔ خصوصاً مشرقی ممالک میں تو غربت اور افلاس نے لوگوں کے لیے جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھنا قریب قریب ناممکن بنا دیا ہے۔

طبی ترقی کے اس دور میں کروڑوں افراد طبی سہولتوں سے یکسر محروم ہیں اور معمولی بیماریوں کا تو ذکر ہی کیا وہ شدید علالت کے وقت بھی اپنے لیے کسی معمولی علاج معالجہ کا انتظام نہیں کر سکتے۔ دنیا کی کسی قوم کے اندر بھی عدل و انصاف کی حس باقی نہیں رہی۔ ہر طاقتور قوم جب موقع پاتی ہے تو کمزور اقوام کو ہڑپ کرنے کی کوششیں شروع کر دیتی ہے اور اس معاملے میں کسی ضابطہ اخلاق کی پرواہ نہیں کرتی۔

زندگی کے یہ اور اسی نوعیت کے دوسرے لاتعداد مسائل انسانیت پر ہر لمحہ اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ان مسائل نے اس دنیا میں انسان کا جینا دوبھر بنا دیا ہے اور انہیں ہم سے ہر شخص پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے مگر ان کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتا جس کے کہ یہ فی الحقیقت مستحق ہیں۔

پھر ان مسائل کی کوئی نوعیت بھی ایسی نہیں کہ جن کا حل انسان کی دسترس سے باہر ہو۔ مشینوں کی ایجاد نے اشیاء کی پیداوار کو اس حد تک بڑھا دیا ہے کہ اگر خالص انسانی نقطہ نظر سے منصوبہ بندی کر کے اس امر کی کوشش کی جائے کہ دنیا کا کوئی فرد بھی زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے تو یہ ناممکن

نہیں۔ دنیا میں آج جو اربوں نہیں بلکہ کھربوں روپے انسان کو ہلاک کرنے میں صرف کیے جا رہے ہیں۔ انہیں اگر انسان کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے تو دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ایک اچھی خوشحال زندگی کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح آج دنیا کی ہر قوم کے پاس اس قدر وسائل موجود ہیں یا وہ ایسے وسائل کا انتظام کر سکتی ہے کہ دوسری اقوام کے وسائل سے یکسر بے نیاز ہو کر آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ وہ اگر دوسرے ممالک پر قبضہ کرتی ہے تو کسی حقیقی ضرورت کے تحت نہیں کرتی بلکہ محض اپنے استعماری عزائم کی تکمیل کے لیے انہیں اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بناتی ہے۔

انسان پر انسان کی چیرہ دستیوں کو روک کر انسان کے لیے بہتر اور شادکام زندگی کا قیام اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کی حد سے بڑھی ہوئی ہوس کو ختم کیا جائے۔ اس وقت دنیا میں جو ہمہ گیر فساد برپا ہے اس کی وجہ انسان کی حرص ہی ہے اور یہ کوئی ایسی وجہ نہیں جو انسانی ادراک سے ماوراء ہو۔ معمولی فہم و شعور رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ انسان کی خود غرضی نے اس پوری دنیا کو ظلمت کدہ بنا دیا ہے۔ اگر اس میں اعتدال پیدا کیا جائے تو انسانیت کے بہت سے مسائل حل کیے جا سکتے ہیں اب سوال یہ ہے کہ آخر انسان چاند کی طرف تو بڑے جذبۂ شوق سے لپکتا ہے مگر اپنے دل کے اندر جھانک کر فساد کے ان مراکز کو دیکھنے کی کیوں کوشش نہیں کرتا، جنہوں نے اس کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔

یہ تو خیر داخلی زندگی کا مسئلہ ہے خود انسان کی خارجی زندگی میں بے شمار مسائل ایسے ہیں جو سائنس دانوں کی توجہ کے محتاج ہیں۔ دنیا میں ابھی کرۂ ارض کا اچھا خاصہ حصہ ایسا ہے جو بے آب و گیاہ ہونے کی وجہ سے بیکار پڑا ہے۔ متعدد ایسی بیماریاں ہیں جن کا ابھی تک علاج دریافت نہیں ہوا اور انسانوں کی اچھی خاصی تعداد ان کا لقمۂ اجل بن رہی ہے مگر ان کے تدارک کے لیے اس جوش اور انہماک اور اس ایثار کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا جو جوہری بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اگر ان سائنسی تحقیقات کا مقصد فلاح انسانیت ہوتا

تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انسان سب سے زیادہ توجہ ان امور کی طرف دیتا جن سے انسانیت کو حقیقی بہبود حاصل ہوتی۔ اس ضمن میں انسان سب سے پہلے اصلاح باطن کی طرف متوجہ ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں یہ فرمایا ہے کہ "تمہارے پہلو میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہے تو تمہارا پورا جسم صحیح ہے اور اگر اس میں فساد ہے تو پھر سارا جسم فساد کی لپیٹ میں ہے"۔ جب تک اخلاقی اور روحانی احساس کے اس سرچشمے کو حرص و آز، خود غرضی اور زبردست آزاری سے پاک نہیں کیا جاتا اس وقت تک سائنسی تحقیقات سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اگر انسان واقعی انسانیت سے محبت و ہمدردی رکھتا ہے اور وہ سچے دل سے اس کی فلاح کا طالب ہے تو اسے سب سے زیادہ توجہ تہذیب نفس کے اس بنیادی کام پر دینی چاہیئے مگر افسوس کہ اس کام سے وہ سب سے زیادہ غفلت برت رہا ہے۔ انسان کی بدنصیبی دیکھیئے کہ وہ عالم طبیعات میں اپنی ہنرمندی اور جرأت دکھلانے کے لیے تو ہر قسم کے ایثار کے لیے آمادہ ہوتا ہے مگر اپنے نفس پر کوئی معمولی سی پابندی عائد کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔ کیونکہ یہ کام اگرچہ زندگی میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے مگر چاند پر اترنے سے جو سنسنی خیزی پیدا ہو سکتی ہے وہ تہذیب نفس سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی وجہ سے یہ کام اس کی توجہ کا مستحق نہیں بن سکتا۔

اس وقت انسانیت کا سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ یہی ہے کہ کس طرح انسان کو اس بات کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ عالم طبیعات سے دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کی طرف متوجہ ہو۔ یہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان کے بارے میں جو غلط نظریات پھیلے ہوئے ہیں ان کا ابطال کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ نہ تو حیوان ہے اور نہ معاشرے کی مشین کا بے بس پرزہ بلکہ ایک صاحب ارادہ اور اخلاقی اور روحانی احساس رکھنے والی ایک قابل احترام ہستی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ حیوانوں اور مشینوں کا سا سلوک کرنا سخت ناانصافی ہے . . . جب تک نوع بشری اس کے جذبات و احساسات کو نظر انداز کر کے اُس کے ساتھ یہ ظالمانہ طرز عمل اختیار کرنے پر مصر رہے گی اس وقت تک انسان کے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی پیدا نہیں

ہو سکتی۔

جو لوگ انسان نما حیوان یا انسان نما مشین کو جوہر انسانیت سے از سر نو آراستہ کرنے کے متمنی ہیں ان پر سب سے پہلا فرض یہ عاید ہوتا ہے کہ وہ ان نظامہائے حیات کے خلاف صف آرا ہوں جنہوں نے اسے اعلیٰ اور ارفع مقام سے گرا کر ایک مشین یا حیوان کی سطح پر لا ڈالا ہے۔ ڈاروِن اور اس کے ہم خیال سائنس دانوں نے انسان کا رشتہ حیوان کے ساتھ جوڑا اور اسے جنت کی مخلوق کے زمرہ سے نکال کر بندر اور مانس کے ساتھ لا کھڑا کیا اور وطنیت اور قومیت کے نام پر اس سے حیوانوں کی طرح بے دریغ کام لیا جانے لگا۔

اسی مشینی دور میں انسان کو یہ گوارا نہ تھا کہ انسان حیوان کی سطح پر بھی رہے وہ اسے تمام احساسات و جذبات سے محروم کر کے بے حس مشین بنا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس کے ذہن میں یہ باطل خیال جاگزیں کیا گیا کہ ہر دَور کے معاشی حالات خصوصاً پیدائش دولت کے ذرائع نہ صرف اِس دَور کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان کی پوری طرح صورت گری بھی کرتے ہیں یا دوسرے الفاظ میں ہر دَور کی سیاست، معیشت اور معاشرت پیدائش دولت کے طریقوں کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی معاشی قوتوں کی کرشمہ سازی ہے اور وہ جس سانچے میں چاہیں اِسے بڑی آسانی کے ساتھ ڈھال سکتی ہیں۔

یہ تو اجتماعی زندگی کا وہ مادی تصور ہے جسے مارکس نے پیش کیا ہے انسان کی انفرادی زندگی یعنی اس کے ذاتی احساسات و جذبات، اس کے عقائد و تصورات اور اس کے اخلاقی میارات بھی مارکس کے نزدیک اِس دَور کے معاشی حالات کا پرتو ہی ہوتے ہیں جس میں کوئی انسان زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی افکار و نظریات یا معتقدات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو کسی مستقل قدر و قیمت کی حامل ہو۔ اور انسان کے اندر کوئی ایسا جذبہ یا احساس موجود نہیں جسے انسانیت کا پائیدار مستقل و حقیقی جوہر کہا جا سکے۔ ہر دور کا اپنا الگ ایمان اور الگ جوہرِ انسانیت ہے جس کا انسان کے روحانی احساسات سے قطعاً

کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے وجود کے لیے سرتاپا پیدائش دولت کے طریقوں کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں اس طرزِ فکر نے نہ صرف انسان کا انسانیت کی وسیع برادری سے رشتہ منقطع کر دیا ہے بلکہ اسے انسانیت کی مشترک میراث سے محروم کر کے اسے عملاً اپنے دور کے معاشرے کی ایک بے حس مشین بنا کر رکھ دیا ہے۔

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۲)

تقسیم غنائم کا مسئلہ توریثِ مسلم من الکافر اور دیتِ معاہد کا مسئلہ ضروری حد تک پچھلے "ترجمان" میں صاف کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد "البلاغ" کی ترتیب کے مطابق اب مالِ غنیمت کا مسئلہ زیرِ بحث آتا ہے۔ اس میں مولانا مودودی کی جس عبارت کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، وہ درجِ ذیل ہے:-

"مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملے میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رُو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اُس فوج میں تقسیم ہونے چاہییں جو لڑائی میں شریک ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لیے الگ نکال دیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔"

مولانا مودودی نے اس بات کی سند میں پانچ کتابوں کے حوالے دیئے تھے جن میں سے پانچواں اور سب سے آخری حوالہ البدایہ والنہایہ کا تھا۔ اب جناب محمد تقی صاحب نے کیا یہ ہے کہ باقی کتابوں کو چھوڑ کر صرف البدایہ کا حوالہ نقل کر دیا ہے کہ زیاد نے حضرت حکمؓ بن عمرو کو یہ لکھا کہ امیر المومنین (حضرت معاویہؓ) کا خط آیا ہے کہ سونا چاندی ان کے لیے الگ کر لیا جائے اور اس مالِ غنیمت کا سارا سونا چاندی بیت المال کے لیے جمع کیا جائے۔ اس حوالے کی بنیاد پر عثمانی صاحب نے استدلال و قیاسات کی عجیب عمارت کھڑی کی ہے فرماتے ہیں:

۱- اس حکم کی رُو سے حضرت معاویہؓ کی ذات کے لیے سونا چاندی الگ کیا جانا مقصود نہیں تھا، بلکہ

بیتُ المال کے لیے نکالنا پیش نظر تھا، جیسا کہ الفاظ لبیت المال بتا رہے ہیں۔

۲- البدایہ یا کسی دوسری کتاب میں حضرت معاویہؓ کا حکم براہِ راست منقول نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ زیادؔ نے خواہ مخواہ ان کی طرف یہ بات منسوب کر دی ہو۔

۳- مولانا مودودی نے اس حکم کا ذکر تو کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی، حالانکہ کتابوں میں تصریح ہے کہ تعمیل نہیں ہوئی۔

۴- اگر زیاد کو سچا مان لیا جائے، تب بھی یہ حکم ایک خاص جہاد سے متعلق تھا۔ مستقل طور پر جاری نہیں ہوا تھا۔

۵- عین ممکن ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو اور حضرت معاویہؓ اندازے یا اطلاع کی بنا پر سمجھے ہوں کہ وہ کُل مالِ غنیمت کے پانچویں حصّے سے زاید نہیں، اس لیے انہوں نے یہ حکم جاری فرمایا ہو کہ مالِ غنیمت میں صرف سونا چاندی ہی بھیجا جائے۔ لیکن حضرت حکم بن عَمرو نے اس لیے اظہار ناراضگی فرمایا ہو کہ فی الواقع سونا چاندی ۱/۵ سے زائد تھا، اس لیے وہ سارا سونا چاندی بیت المال میں داخل کرنے کو کتاب اللہ کے خلاف تصور کرتے تھے۔

اتنی ممکن یا غیر ممکن تاویلات کے بعد مدیر البلاغ لکھتے ہیں کہ "اس مجمل واقعے کی بہت سی توجیہات ممکن ہیں، اور یہ بات عقل و دیانت کے قطعی خلاف ہو گی کہ ہم ان قوی احتمالات کو قطعی طور پہ رد کر دیں اور ضعیف احتمالات کی بنا پر حضرت معاویہؓ کے خلاف کتاب و سنت کے احکام کی خلاف ورزی کا حکم لگا دیں"

اس سلسلہ میں میری پہلی گزارش یہ ہے کہ بلاشبہ البدایہ میں یہی بات مذکور ہے کہ یہ سونا چاندی بیت المال کے لیے الگ کیے جانے کا حکم دیا گیا تھا لیکن بقیہ چار کتابوں میں سے کسی ایک میں بھی بیت المال کا ذکر موجود نہیں ہے بلکہ زیاد کا صرف یہ قول نقل ہوا ہے کہ امیر المؤمنین نے یہ لکھا ہے کہ ان کے لیے سونا چاندی الگ کر لیا جائے (اصطفی لہ الصفراء والبیضاء۔ تاریخ ابن جریرؒ (متوفی ۳۱۰ھ) میں بھی بیت المال کے الفاظ نہیں ہیں۔ ابن سعدؒ (متوفی ۲۳۰ھ)، ابن عبد البرؒ (متوفی ۴۶۳ھ)، ابن الاثیر (متوفی ۶۳۰ھ)، کسی نے بھی بیت المال کا ذکر اپنی اُن کتابوں میں نہیں کیا جن کا حوالہ مولانا مودودی نے دیا ہے۔ حافظ

ابن کثیرؒ (متوفی ۷۷۴ھ) جو سب سے بعد میں آتے ہیں، صرف انہوں نے یہ لکھا ہے کہ امیر معاویہؓ نے یہ سونا چاندی بیت المال کے لیے طلب کیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ آٹھویں صدی ہجری تک ابن کثیرؒ سے پہلے جن لوگوں نے اس واقعہ کو نقل و روایت کیا ہے اور جنہوں نے ان پہلی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے، کیا ان کا یہ بیان کرنا یا یہ سمجھنا بالکل غلط ہو گا کہ امیر معاویہؓ نے یہ مال اپنی ذات کے لیے طلب کیا تھا، بالخصوص جبکہ بیت المال کی پوزیشن بھی اُن کے زمانہ میں وہ ہو جسے دیت کی بحث میں ہم پہلے بیان کر چکے ہیں؟ اگر صرف ابن کثیرؒ کے الفاظ "لبیت المال" کی روشنی میں دوسرے تمام مؤرخین کی عبارت کا منشا بھی یہی سمجھا جائے کہ سونا چاندی بیت المال کے لیے الگ کیے جانے کا حکم دیا گیا تھا، تو پھر بیت المال کی عدمِ تصریح کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ان مؤرخین کے نزدیک دَورِ ملوکیت میں بیت المال اور امیر المؤمنین کے ذاتی خزانے کے درمیان کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ ورنہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اصطفیٰ لہٗ یا تصطفی لہٗ کے مغالطہ انگیز الفاظ کیوں استعمال کرتے جن کا متبادر مفہوم یہی ہے کہ امیر معاویہؓ نے اپنے لیے سونا چاندی خاص کر لینے کا حکم دیا تھا؟ تاہم اگر یہی مان لیا جائے کہ یہ حکم بیت المال کے لیے تھا، پھر بھی یہ قرآن و سنت کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال کے لیے لینے کا حکم دیا گیا ہے، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر خلفائے راشدین کے آخری زمانے تک اسی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس امر کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ سونا اور چاندی مالِ غنیمت سے الگ نکال کر بیت المال میں داخل کر دیا گیا ہو، اور قرآن مجید کے الفاظ میں بھی اس تخصیص کے لیے کوئی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اس فعل کی تائید میں یہ استدلال بھی مہمل ہے کہ اس وقت بیت المال میں سونے چاندی کی کمی تھی جسے امیر معاویہؓ پورا کرنا چاہتے تھے۔ اُس زمانے میں مبادلۂ زر اور تبادلۂ اشیاء کا نظام زیادہ پیچیدہ نہ تھا اور سونے چاندی کے ذخائر بیت المال کے استحکام کے لیے محفوظ رکھنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین بسا اوقات اسے ترجیح دیتے تھے کہ بیت المال میں سونے چاندی کے بجائے ضروریاتِ زندگی کا سامان آئے اور مسلمانوں میں تقسیم ہو۔

دوسری بات عثمانی صاحب نے یہ کہی ہے کہ امیر معاویہؓ کا حکم براہِ راست منقول نہیں ہوا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ زیاد نے خود ہی اسے گھڑ لیا ہو۔ یہ بڑی نرالی منطق ہے۔ اس طرح کے مجرد عقلی احتمالات کی بنا پر تو ہر شے کا انکار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ غزوہ اور غنیمت کا قصہ سرے سے پیش ہی نہیں آیا تھا۔ زیاد یا مؤرخین اگر مکاتیب و قصص گھڑنے میں ایسے ہی ماہر تھے تو وہ ایک پورا مکتوب امیر معاویہؓ کی طرف سے بصیغۂ متکلم بھی وضع کر سکتے تھے اور اسے کتابوں میں نقل کر سکتے تھے۔ لیکن عثمانی صاحب کو خود سوچنا چاہیے کہ امیر معاویہؓ جن کے نظم و ضبط اور ڈسپلن کا تذکرہ مؤرخین نے جابجا بیان کیا ہے، کیا ان کے ایک گورنر کی یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ ایک جعلی حکمنامہ زبانی یا تحریری طور پر امیر معاویہ کی طرف منسوب کرے، اُسے مسلمانوں کے پورے لشکر اور سپہ سالار کے سامنے پیش کرے اور پھر یہ بات امیر معاویہؓ تک نہ پہنچے اور اس کی کوئی تحقیق و تفتیش ہی نہ ہو، اور زیاد سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو؟ جبلِ اشل (یا اسل) کا یہ غزوہ ۴۵ھ میں پیش آیا، اور حضرت معاویہؓ اس واقعہ کے بعد پندرہ برس تک زندہ رہے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ زیاد کے اس حکم، اور سپہ سالارِ لشکر کے اس پر اعتراض اور اس حکم کی تعمیل سے اُس کے انکار کا سارا قصہ ۱۵ برس تک حضرت معاویہؓ کے علم میں نہ آیا ہو؟ مزید براں کیا یہ بھی باور کیا جا سکتا ہے اگر اس حکم کا امیر معاویہؓ کی طرف سے ہونا مشتبہ ہوتا تو عثمانی صاحب سے پہلے کوئی مؤرخ اس کے مشتبہ ہونے کی طرف اشارہ تک نہ کرتا اور سب اُسے ان کے حکم ہی کی حیثیت سے روایت کرتے چلے جاتے؟ آخر مروان کا ایک خط بھی فسادیوں نے یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ یہ حضرت عثمانؓ کی طرف سے ہے اور اس پر حضرت عثمانؓ کی مہر ہے۔ لیکن اُس وقت بھی اسے مشکوک سمجھا گیا اور اس کے بعد بھی بعض حضرات نے اس خط کو جعلی قرار دیا۔ خود حضرت عثمانؓ تک بھی اس کی شکایت پہنچائی گئی اور آپ نے خط کی صحت سے انکار کیا۔

پھر مدیر البلاغ کا اعتراض یہ بھی ہے کہ مولانا مودودی نے یہ نہیں بتایا کہ اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ اگر امیر معاویہؓ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی اور مولانا مودودی نے اسے بیان نہیں کیا تو اس سے اصل حکم کے حسن و قبح میں کیا کمی بیشی ہو سکتی ہے؟ امیر معاویہؓ اگر خود اس حکم کو منسوخ کر دیتے یا کم از کم اس کی تعمیل نہ ہونے پر اظہارِ ناراضی ہی نہ فرماتے تو سارے معاملے کی نوعیت بدل جاتی۔ لیکن اس حکم کے نہ ماننے جانے کی جو تفصیلات مؤرخین نے بیان کی ہیں، وہ تو ایسی ہیں کہ شاید مولانا نے انہیں

قصداً نظرانداز کیا ہے، کیونکہ ان سے امیر معاویہؓ کی پوزیشن صاف ہونے میں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ آخر ما ت تو "البلاغ" میں بھی نقل کر دی گئی ہے کہ حضرت حکمؓ نے جواب میں لکھا تھا کہ "اللہ کی کتاب امیر المومنین کے خط پر مقدم ہے اور خدا کی قسم اگر آسمان و زمین کسی کے دشمن ہو جائیں اور وہ اللہ سے ڈرے، تو اللہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال دیتا ہے ..." یہ بات پانچوں کتابوں میں مذکور ہے اور اس کے بعد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حکمؓ نے دعا کی کہ "اے اللہ اگر میرے لیے تیرے پاس خیر ہے تو مجھے دنیا سے اٹھا لے"، چنانچہ ان کا بعد میں انتقال ہو گیا۔ امام حاکم نے بھی المستدرک ج ۳ صفحہ ۴۴۲ پر ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ زیاد نے لکھا تھا "فان امیر المومنین کتب ان یصطفیٰ لہ الصفراء والبیضاء ..." آگے لکھتے ہیں "وان معاویۃ لما فعل الحکم فی قسمۃ الفیٔ ما فعل وجہ الیہ من قیدہ وحبسہ فمات فی قیودہ" (جب حضرت حکمؓ نے تقسیم فے میں یہ طرز عمل اختیار کیا تو امیر معاویہؓ نے اپنا فرستادہ بھیجا جس نے حضرت حکمؓ کو مقید و محبوس کر لیا اور اسی حال میں ان کا انتقال ہوا)۔ بعینہٖ یہی پوری روایت امام ذہبیؒ نے مستدرک کی تلخیص میں بھی درج کی ہے۔

عثمانی صاحب نے ایک نکتہ یہ بھی نکالا ہے کہ یہ حکم ایک خاص جہاد سے متعلق تھا، مستقل طور پر جاری نہیں ہوا۔ جواباً عرض ہے کہ یہ تو مولانا مودودی نے بھی نہیں کہا کہ یہ کوئی مستقل حکم تھا بلکہ یہی لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے ایسا حکم دیا لیکن کیا ایک مرتبہ کوئی خلافِ کتاب و سنت حکم دینا قابلِ اعتراض نہیں ہے؟ اور اعتراض کی گنجائش صرف اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب مستقل طور پر کتاب و سنت کے خلاف کوئی عمل کرتے رہنے کا حکم دیا جائے؟

آخر میں دلچسپ ترین احتمال آفرینی جو "البلاغ" نے کی ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے بیت المال میں سونے چاندی کی کمی ہو اور حضرت معاویہؓ کو معلوم ہوا ہو کہ غنیمت میں سونے چاندی کی قیمت کل مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ ہے لیکن فی الواقع وہ ۱/۵ سے زائد ہو، اس لیے حضرت حکمؓ سارا سونا چاندی الگ کرنے کو کتاب اللہ کے خلاف سمجھتے ہوں۔ یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر حضرت معاویہؓ کا ذریعۂ معلومات اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ فوج کا سپہ سالار یا کوئی ماتحت افسر انہیں غنیمت کی مقدار سے آگاہ کرتا، اور یہ بھی اسی صورت

میں ممکن تھا جب پورا مالِ غنیمت یکجا ہو چکا ہو اور اس کی قیمت بھی لگ گئی ہو۔ اگر فی الواقع ایسی ہی صورت تھی تو پھر امیر معاویہؓ اور حضرت حکمؓ کے تخمینے میں کوئی تفاوت نہیں ہونا چاہیے تھا کہ ایک کے اندازے میں سونا چاندی پورے مال کا $\frac{1}{5}$ ہو اور دوسرے میں اس سے زائد۔ نیز اس صورت میں امیر معاویہ کا حکم یہ ہوتا کہ سونا چاندی چونکہ خمس کے مساوی ہے، اس لیے دوسرے مال کو چھوڑ کر دہی بطورِ خمس لے لیا جائے۔ ایسی صورت میں سرے سے کوئی اختلاف ہی رونما نہ ہوتا اور نہ حضرت حکمؓ پر اس واقعے کا ایسا شدید ردِ عمل ہوتا جو بالآخر ان کی موت پر منتج ہوتا۔ اگر فی الواقع بات اتنی ہی ہوتی کہ سونے چاندی کا محض خمس سے کچھ زاید ہونا محلِ نزاع تھا تو حضرت حکمؓ یہ کہہ سکتے تھے کہ اتنا سونا چاندی $\frac{1}{5}$ سے زائد بنتا ہے، اس لیے اسے فوج میں تقسیم ہونا چاہیے۔ وہ ہرگز یہ جواب نہ دیتے کہ کتاب اللہ کتابِ امیر پر مقدم ہے اور غازیوں سے ہرگز نہ کہتے کہ چلو، تم اس حکم کے علی الرغم مالِ غنیمت کو تقسیم کر لو۔

پھر میں مولانا محمد تقی صاحب اور دوسرے قارئین کے علم میں یہ بات بھی لانا چاہتا ہوں کہ تاریخ طبری جو تواریخ مابعد کا مأخذ ہے، اُس میں امیر معاویہؓ کا جو حکم زیاد کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے، اس کے الفاظ ہیں: اصطفی لہ صفراء و بیضاء والروائع فلا تحرکن شیئاً حتی تخرج ذالک ... پھر حضرت حکمؓ کا جو جواب زیاد کے نام منقول ہے اس میں بھی بعینہٖ یہی الفاظ وارد ہیں کہ تمہارا خط مجھے ملا جس میں یہ ذکر ہے: ان اصطفی لہ صفراء و بیضاء والروائع۔ اس سے معلوم ہوا کہ امیر معاویہؓ نے فقط سونے چاندی ہی کا مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ اموالِ غنیمت میں سے دوسری نفیس اور عمدہ اشیاء بھی مانگی تھیں اور فرمایا تھا کہ جب تک ان سب کو الگ نہ چھانٹ لیا جائے، کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلائی جائے۔ اس کے بعد اگر حضرت حکمؓ بن عمرو نے انتہائی دل گرفتگی کے عالم میں وہ دعا مانگی جو تاریخوں میں بیان ہے، تو اس پر مجھے کوئی تعجب نہیں ہے۔ میں یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ حضرت حکمؓ بن عمرو بھی کوئی معمولی پائے کے صحابی نہیں ہیں۔ ان سے امام بخاریؒ اور دوسرے اصحابِ صحاح نے حدیث اخذ کی ہے۔ مستدرک اور دوسری کتابوں میں ان کے جو حالات بیان ہوئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ دَورِ فتن کے محاربات میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور سب سے الگ تھلگ رہے۔ آخر کار امیر معاویہؓ کے عہد میں انہوں نے اس غزوے کی قیادت کی جس کا

یہ دردناک انجام ہوا۔

سبِ علیؓ کا مسئلہ | مالِ غنیمت کے مسئلے کے بعد حضرت علیؓ پر سب و شتم کا مسئلہ آتا ہے۔ اس موضوع پر مولانا مودودی کی تحریر کا اقتباس دے کر عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ پر خود سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے، سو حضرت معاویہؓ کی طرف اس مکروہ بدعت کو منسوب کرنے کے لیے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالہ کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں، بلکہ آس پاس بھی بنظرِ غائر دیکھا چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ خود معاذ اللہ اس "انسانی اخلاق کے خلاف" فعل کا ارتکاب کرتے تھے اس لیے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں۔ چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے لیکن یقین فرمائیے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جن کے مصنف شیعہ تھے، مثلاً مروج الذہب؛ لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔"

عثمانی صاحب نے یہاں اور آگے چل کر جس طرح سبِ علیؓ کے معاملے میں حضرت معاویہؓ کی براءتؓ ثابت کرنے کی سعی کی ہے، میں اس کے جواب میں پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ امیر معاویہؓ نے خلیفہ بننے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی سبِ علیؓ و اہلِ بیت النبیؐ کی مہم خود اپنی سرپرستی میں باقاعدہ جاری کی تھی اور یہ بنو امیہ کے دور میں منبروں پر مسلسل جاری رہی، تا آنکہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے آکر اسے مٹایا۔ یہ بات جس طرح تاریخ و حدیث کی کتابوں میں مذکور ہے وہ اسے قطعیت و تواتر کا درجہ دے رہی ہے۔ مولانا مودودی کے حوالوں میں کوئی خلا یا تشنہ پہلو تلاش کر کے اُسے زور آزمائی کے لیے منتخب کر لینے سے حقیقی مسئلہ کالعدم نہیں ہو سکتا۔ مجھے عثمانی صاحب کی شکایت اس حد تک تسلیم ہے کہ جن مقامات کے حوالے مولانا مودودی نے دیئے ہیں، وہاں یہ بات

صراحتہً مذکور نہیں کہ امیر معاویہؓ خود سب و شتم کرتے تھے[1] بلکہ اتنی بات بیان کی گئی ہے کہ گورنروں کو اس کی ہدایت کی گئی تھی۔ لیکن انہی کتابوں کے بعض دوسرے مقامات پر امیر معاویہؓ کا اپنا ہی فعل منقول ہے، اس لیے مدیر موصوف اپنے الفاظ کی منظر کشی سے یہ جو تاثر دینا چاہتے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے خود نہ کبھی ایسا کیا، نہ کسی سے کرنے کو کہا، یہ تاثر بالکل غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ موصوف کا بیان یہ ہے کہ انہوں نے مولانا کی ذکر کردہ کتابوں، بلکہ دوسری تاریخوں کے سارے مقامات پر جستجو کی لیکن ایسی کوئی بات کسی کتاب میں نہ ملی۔ میں سردست دوسری کتابوں سے نہیں، البدایہ والنہایہ ہی سے ایک حوالہ پیش کرتا ہوں جسے کھنگالنے کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے:

قال ابو زرعة ... عن عبد الله بن ابی نجیح عن ابیه قال: لما حج معاویة اخذ بید سعد بن ابی وقاص و ادخله دار الندوة فاجلسه معه علی سریرہ ثم ذکر علی بن ابی طالب فوقع فیه۔ فقال: ادخلتنی دارک و اجلستنی علی سریرک ثم وقعت فی علیؓ تشتمه والله لان یکون فیّ احدی خلاله ثلاث احب الیّ من ان یکون لی ما طلعت علیه الشمس. ولان یکون لی ما قال له حین غزا تبوکاً الا ترضی ان تکون منی بمنزلة ھارون من موسیٰ الا

ابو زرعہ دمشقی عبداللہ بن ابی نجیح کے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب معاویہؓ نے حج کیا تو انہوں نے سعد بن ابی وقاص کا ہاتھ سے پکڑا اور دار الندوہ میں لے جاکر اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ پھر علیؓ بن ابی طالب کا ذکر کرتے ہوئے ان کی عیب جوئی کی۔ حضرت سعدؓ نے جواب دیا: "آپ نے مجھے اپنے گھر میں داخل کیا اپنے تخت پر بٹھایا، پھر آپ نے علیؓ کے حق میں بدگوئی اور سب و شتم شروع کر دی۔ خدا کی قسم اگر مجھ میں علیؓ کے تین خصائص و فضائل میں سے ایک بھی ہو تو وہ مجھے اس کائنات سے زیادہ عزیز ہو جس پر سورج

---

[1] ہو سکتا ہے کہ مولانا مودودی سے کوئی حوالہ رہ گیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ مطالعۂ کتب سے ایک مجموعی اور مشترک مضمون انہوں نے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہو اور کچھ حوالے دے کر بقیہ کو قصداً نظر انداز کر دیا ہو۔ بہرکیف "البدایہ والنہایہ" جس کے دو مقامات کا حوالہ مولانا نے درج کیا ہے، اسی کتاب کے ایک تیسرے مقام پر وہ بات مذکور ہے جسے میں نقل کر رہا ہوں۔

انه لا نبی بعدی احب الیّ مما طلعت
علیه الشمس - ولان یکون لی ما قال
له یوم خیبر؟ لاعطینّ الرایة رجلاً
یحب الله ورسوله ویحبه الله ورسوله-
یفتح الله علی یدیه لیس بفرار" احب الیّ
مما طلعت علیه الشمس - ولان اکون
صهره علی ابنته ولی منها من الولد ماله
احب الیّ من ان یکون لی ما طلعت علیه
الشمس، لا ادخل علیك داراً بعد هذا
الیوم، ثم نفض رداءه ثم خرج -

(البدایه والنهایه ج ۷، ص ۳۴۱)

طلوع ہوتا ہے۔ کاش کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے
حق میں یہ فرمایا ہوتا، جب کہ آنحضورؐ غزوۂ تبوک پر تشریف
لے گئے، تو آپ نے علیؓ کے حق میں فرمایا"کیا تم اس پر
راضی نہیں ہو کہ میرے لیے تم ویسے ہی ہو جیسے ہارونؑ
موسیٰؑ کے لیے تھے، الّا یہ کہ میرے بعد نبی نہیں" یہ ارشاد
میرے نزدیک دنیا و مافیہا سے محبوب تر ہے۔ پھر کاش
کہ میرے حق میں وہ بات ہوتی جو آنحضورؐ نے خیبر کے روز
علیؓ کے حق میں فرمائی کہ "میں جھنڈا اس شخص کو دونگا جو اللہ
اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ اور
اس کے رسولؐ اس سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ اس کے
ہاتھ پر فتح دیگا، وہ بھاگنے والا نہیں ہے" یہ ارشاد بھی
مجھے دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب ہے۔ اور کاش کہ مجھے
بھی آنحضورؐ کی دامادی کا شرف نصیب ہوتا اور آنحضورؐ کی
صاحبزادی سے میرے ہاں وہ اولاد ہوتی جو علیؓ کو حاصل ہے۔
تو یہ بھی میرے لیے دنیا و مافیہا سے عزیز تر ہوتا۔ آج کے بعد میں
آپ کے گھر میں کبھی داخل نہیں ہونگا۔ پھر حضرت سعدؓ نے اپنی چادر
جھٹکی اور وہاں سے نکل گئے۔

ممکن ہے کہ مدیر "البلاغ" اس روایت کو بھی "گری پڑی" کہنے کی جرأت کریں اور کتبِ رجال کی ورق گردانی شروع کر دیں، مگر میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کے شواہد و متابعات مسلم اور ترمذی میں بھی موجود ہیں۔ مسلم کی ایک حدیث یہ ہے:

عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیه

حضرت سعد بن ابی وقاص کے صاحبزادے عامر اپنے

قال امر معاویة بن ابی سفیان سعداً فقال ما منعك ان تسب ابا تراب فقال اما ما ذکرت ثلاثاً قالهن له رسول الله صلی الله علیه وسلم فلن اسبه لان تکون لی واحدة منهن احب الی من حمر النعم . . .

(مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ، باب فضائل علیؓ)

والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاویہؓ نے حضرت سعد کو حکم دیا اور پھر کہا کہ آپ کو کس چیز نے روکا ہے کہ آپ ابوتراب (حضرت علیؓ) پر سب وشتم کریں؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب میں اُن تین ارشادات کو یاد کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمائے تھے تو میں ہرگز ان پر سب وشتم نہیں کر سکتا۔ ان تین مناقب میں سے اگر ایک منقبت بھی میرے حق میں ہوتی تو مجھے سُرخ اونٹوں سے زیادہ محبوب ہوتی۔

اس کے بعد حضرت سعدؓ نے وہ تینوں مناقب بیان کیے جو اوپر البدایہ کی روایت میں مذکور ہو چکے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ تیسرا ارشاد مسلم (اور ترمذی) میں یوں نقل ہے کہ جب یہ آیتِ مباہلہ اُتری کہ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَنَا . . . . . تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، فاطمہ، حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور فرمایا اَللّٰھُمَّ ھٰؤلاءِ اھلی (اے میرے اللہ، یہ میرے اہل وعیال ہیں)۔ معنوی لحاظ سے دونوں باتوں میں کوئی اختلاف نہیں بعض شارحین نے مسلم اور ترمذی کی حدیث کے لفظ سب کی توجیہ یہ کی ہے کہ اس سے مراد بدگوئی نہیں، بلکہ امیر معاویہؓ کی مراد یہ تھی کہ آپ حضرت علیؓ کے اجتہادات و آراء کو غلط اور میرے اجتہاد کو صحیح کیوں نہیں کہتے۔ لیکن یہ توجیہ بالکل بے محل ہے اور لغت یا سیاقِ کلام میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اگر سوال محض اجتہاد کے صواب وخطا کا تھا، تو اس کے جواب میں حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب کے بیان کا کیا موقع تھا؟ غلطی یا اجتہادی غلطی تو حضرت علیؓ سے ان فضائل کے باوجود صادر ہو سکتی تھی۔ پھر ابن کثیر کی روایت میں جو نقشہ بیان ہوا ہے کہ امیر معاویہؓ کی بات سُن کر حضرت سعدؓ ایسے برافروختہ ہو گئے کہ دامن جھاڑ کر یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ میں آئندہ آپ کے گھر میں کبھی قدم نہیں رکھوں گا، یہ فعل صاف طور پر صورتِ حال کی سنگینی کو واضح کر رہا ہے۔[1] فتح الباری باب مناقب علی کی شرح میں مسند ابی یعلی کے حوالے سے حضرت سعدؓ کے یہ

[1] اس حدیث اور لفظ سب کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ایک جواب فتاویٰ عزیزیہ، مترجم (شائع کردہ سعید کمپنی) صفحہ ۴۱۳

الفاظ منقول ہیں: لو وضع المنشار علی مفرقی علی ان اسبّ علیاً ما سببتہ ابداً (اگر آری میرے سر پر رکھ کر مجھے علیؓ کی بدگوئی کا حکم دیا جائے تو بھی میں ہرگز ان کی بدگوئی نہ کرونگا)۔

ان روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ امیر معاویہؓ نے سبِّ علی کا ایک عام طریقہ رائج کر رکھا تھا حتیٰ کہ انہوں نے حضرت سعدؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی اس کا حکم دیا، حالانکہ وہ عشرۂ مبشرہ میں سے تھے اور دورِ فتن میں بالکل گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ جب انہوں نے اس فرمائش کی تعمیل نہ کی تو امیر معاویہؓ نے اس پر گرفت کرتے ہوئے جواب طلبی کی اور حضرت سعدؓ کو صاف بیانی سے کام لینا پڑا۔ ممکن ہے کہ عثمانی صاحب یہاں نکتہ اٹھائیں کہ اس میں منبر کا ذکر نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ ایسا فعل جس کا دوسروں کو امر کیا جائے اور جس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں بازپرس کی جائے کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس کا ارتکاب علانیہ نہ ہو۔ پھر بالفرض اگر یہ فعل منبر پر کھڑے ہو کر نہیں بلکہ سریر پر بیٹھ کر کیا جائے تو کیا قباحت میں کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے؟ بلکہ ایک طرح سے پرائیویٹ مجلس میں سب وشتم اپنے ساتھ اغتیاب کو بھی جمع کر لیتا ہے۔

سبِّ علی کو بالکل ایک غیر واقعی مفروضہ ثابت کرنے کے لیے عثمانی صاحب نے جو دُور از کار دلائل دیئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے قتل پر حضرت معاویہؓ رونے لگے اور ان کی اہلیہ نے کہا کہ آپ رونے کیوں ہیں جبکہ زندگی میں آپ ان سے لڑتے رہے۔ اس سے عثمانی صاحب نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ دیکھو

میں موجود ہے جس میں فرماتے ہیں: "بہتر یہی ہے کہ اس لفظ سے اس کا ظاہر معنی سمجھا جائے۔ غایۃ الامر اس کا یہی ہوگا کہ ارتکاب اس فعل قبیح کا یعنی سب یا حکمِ سب حضرت معاویہؓ سے صادر ہونا لازم آئے گا۔ تو یہ کوئی اول امرِ قبیح نہیں ہے جو اسلام میں ہوا ہے۔ اس واسطے کہ درجہ سب کا قتل وقتال سے بہت کم ہے۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ سباب المؤمن فسوق وقتالہ کفر (یعنی برا کہنا مومن کو فسق ہے اور اس کے ساتھ قتال کرنا کفر ہے") اور جب قتال اور حکمِ قتال کا صادر ہونا یقینی ہے، اس سے چارہ نہیں، تو بہتر یہی ہے کہ ان کو مرتکب کبیرہ کا جاننا چاہیے لیکن زبانِ طعن ولعن بند رکھنا چاہیے۔ اسی طور سے کہنا چاہیے جیسا صحابہؓ سے ان کی شان میں کہا جاتا ہے جن سے زنا اور شرب خمر سرزد ہوا رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اور ہر جگہ خطاء اجتہادی کو دخل دینا بیباکی سے خالی نہیں۔" انتہیٰ (ترجمہ باقی تو صحیح ہے، البتہ بیباکی کا سماحت کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ بیباکی کے بجائے فیاضی یا دریادلی مناسب تھا۔ غ)۔

آپ کی اہلیہ نے یہ کہا کہ آپ لڑتے رہے، یہ نہیں کہا کہ سب وشتم کی بوچھاڑ کرتے رہے، اس سے ثابت ہوا کہ آپ سبِ علیؓ نہیں کرتے تھے۔ سبحان اللہ کیا نرالا استدلال ہے! اس کا جواب تو وہی ہے جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے دیا ہے کہ خلیفۂ راشد و برحق کے خلاف بغی و قتال تو سباب سے بڑھ کر اور شدید تر ہے۔ ایسی صورت میں امیر معاویہؓ کی اہلیہ محترمہ قتال کو چھوڑ کر سب وشتم کا ذکر کیا کرتیں۔ باقی مجھے اس رونے پر کسی شاعر کا یہ شعر بے اختیار یاد آگیا۔

آئے تربت پہ مری، روئے، کیا یاد مجھے

خاک اُڑانے لگے جب کر چکے برباد مجھے

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے رونے سے تو دراصل یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا ضمیر خود جانتا تھا کہ خلیفۂ وقت سے لڑ کر انہوں نے کس خطائے عظیم کا ارتکاب کیا تھا، اور ان کا دل خوب جانتا تھا کہ بغاوت کے جرم سے قطع نظر، علیؓ جیسے شخص کے مقابلہ میں بجائے خود ان کا دعوائے خلافت کس قدر بے جا تھا۔ اس رونے سے یہ دلیل نہیں لائی جاسکتی کہ وہ ان کی مخالفت میں سرگرم نہ تھے، بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس انسان سے وہ لڑتے رہے، اس کے فضل و کمال کا انہیں خود اعتراف تھا۔

پھر عثمانی صاحب نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ بُسر بن اَرطَاۃ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت زید بن عمرؓ بن خطاب کی موجودگی میں، حضرت علیؓ پر سب وشتم کیا تو حضرت معاویہؓ نے فرمایا تم علیؓ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ اِن (حضرت زید) کے دادا ہیں۔ عجیب بات ہے کہ اس واقعہ سے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امیر معاویہؓ اور آپ کے گورنر سب علیؓ کے الزام سے بری الذمہ ہیں، حالانکہ اس واقعہ سے تو یہ ثبوت مل رہا ہے کہ گورنروں میں اتنی جرأت اور بے باکی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ امیر معاویہؓ کے سامنے اور حضرت علیؓ کے عزیزوں کی موجودگی میں بھی حضرت علیؓ کو گالیاں دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ بُسر بن اَرطَاۃ مدینے میں امیر معاویہؓ کا گورنر تھا۔ اس نے جب یہ حرکت کی تو بلاشبہ پہلے آپ نے اسے ٹوکا۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ اسے البلاغ میں نقل نہیں کیا گیا۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں، ثم ارضا ھما جمیعًا (پھر امیر معاویہؓ نے دونوں کو راضی کر دیا) حالانکہ حضرت زید کا راضی ہونا کیا ہوگا، سوائے اس کے کہ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے ہونگے۔ ایک شخص آپ کے سامنے ایک وفات یافتہ صحابی کی شان میں گستاخی کرے اور آپ اس کے فعل پر تو ناراض نہ ہوں، البتہ اس بات پر

گرفت کریں کہ اس شخص نے سوخات یافتہ بزرگ کی اولاد کی موجودگی میں یہ حرکت کی تھی۔ پھر اس دوہری بیہودگی پر سزا کوئی نہیں، بلکہ دونوں میں راضی نامہ کرا دیا! یہ ہے صفائی کا وہ بیان جسے عثمانی صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ حضرت معاویہؓ کی طرف سے پیش فرما رہے ہیں۔ شاید آج بھی اگر کوئی شخص کسی سید کے سامنے حضرت علیؓ کو گالی دے تو عثمانی صاحب صرف دونوں کے درمیان راضی نامہ کرا دینے کو کافی سمجھیں گے۔

پھر مولانا محمد تقی صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا مودودی کا دعویٰ اس وقت ثابت ہو سکتا ہے جب وہ حضرت معاویہؓ کے تمام گورنروں کی ایک فہرست جمع کر کے ہر ایک کے بارے میں ثابت فرمائیں کہ اس نے انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت علیؓ کو گالیاں دی تھیں اور امیر معاویہؓ نے ایسا کرنے کا حکم دیا تھا۔ میری طرف سے اس متعلق کا جواب یہ ہے کہ جب مختلف و متنوع روایات یہ بات بیان کر رہی ہوں کہ امیر معاویہؓ خود بھی ایسا کرتے تھے، ان کے بعض گورنر بھی ایسا کرتے تھے اور بعض گورنروں کو ایسا کرنے کا حکم امیر معاویہؓ نے دیا تھا، تو یہ ساری تاریخی روایتیں مل جل کر اس امر کا کافی و وافر ثبوت بہم پہنچا دیتی ہیں کہ یہ سلسلۂ واقعات ایک طے شدہ پالیسی کی مختلف کڑیاں تھیں۔ کسی ایک یا دو عاملوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنی اُپج سے اس امر عظیم کا ارتکاب کرتے اور عامۃ المسلمین یا خود امیر معاویہؓ اس سے اغماض برتتے۔ پھر امیر معاویہؓ کا حضرت سعدؓ سے ان الفاظ میں باز پرس کرنا کہ "آپ کو کس بات نے سبِ علیؓ سے روک رکھا ہے" صاف بتا رہا ہے کہ خلوت و جلوت میں اس رسم کا چلن عام ہو چکا تھا اور حضرت سعدؓ کا اس ڈگر پر نہ چلنا معمول کے خلاف ہونے کی وجہ سے کھٹک رہا تھا۔ مولانا مودودی نے جو روایات نقل کی ہیں ان کے متعلق مدیر البلاغ لکھتے ہیں کہ ان کو تھوڑی دیر کے لیے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہا کرتے تھے، اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ حضرت معاویہؓ کے تمام گورنر خود آپ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ حالانکہ ایک آدھ گورنر تک اگر یہ فعل محدود ہوتا تو دو صورتوں سے خالی نہ ہوتا۔ اگر خود امیر معاویہؓ یا دوسرے گورنر اس فعل کو نہ کرتے اور صرف ایک یا دو گورنروں کو حکم ہوتا تو وہ جواب میں ضرور کہتے کہ آخر آپ خود جب یہ کام نہیں کرتے اور کسی دوسرے سے بھی اس کا مطالبہ نہیں ہے تو ہم سے اس کی توقع کیوں کی جاتی ہے؟ اور اگر امیر معاویہؓ کی مرضی کے خلاف کوئی گورنر

ذاتی کد یا پرخاش کی بنا پر ایسا کرتا تو اس کو ضرور سرزنش کی جاتی لیکن جن گورنروں کا واقعہ مذکور ہے، ان کے بارے میں ایسی کوئی تصریح منقول نہیں کہ انہوں نے کوئی ایسی معذرت پیش کی ہو یا کسی بدگوئی کرنے والے گورنر سے کوئی احتساب کیا گیا ہو۔

امیر معاویہؓ کے عہد میں سبِ علیؓ کو رواج دینے کا ثبوت تاریخ کے علاوہ مزید حدیث کی کتابوں سے بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر مسند احمد میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کی متعدد روایات موجود ہیں کہ آپ نے بعض اصحاب سے کہا "ایسبّ رسول اللہ فیکم علی المنابر" (کیا تم لوگوں کے ہاں منبروں پر کھڑے ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب وشتم کا ارتکاب کیا جاتا ہے؟)۔ لوگوں نے پوچھا "انّی ذالک (وہ کیسے؟)۔ حضرت ام سلمہؓ نے فرمایا "الیس یُسبّ علی ومن احبہ؟ اشھد ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یحبہ (کیا علیؓ پر سب وشتم نہیں کیا جاتا اور کیا اس طرح اُن پر (یعنی آنحضورؐ پر) جو علیؓ سے محبت رکھتے تھے سب وشتم نہیں ہوتا؟ میں گواہی دیتی ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیؓ سے محبت رکھتے تھے)۔ ان احادیث میں منبروں پر جس سب وشتم کا ذکر ہے وہ بالیقین عہد معاویہؓ ہی سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ حضرت ام سلمہؓ کی وفات امیر معاویہؓ کی وفات سے ایک سال پہلے ۵۹ھ میں ہو چکی تھی۔ ابوداؤد، کتاب السنۃ، باب الخلفاء میں ایک حدیث حضرت سعیدؓ بن زید سے مروی ہے کہ وہ کوفہ کی مسجد میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے آکر حضرت علیؓ پر لگاتار سب وشتم شروع کر دیا (سبّ وسبّ)۔ مسند احمد، مرویات سعیدؓ بن زید میں تصریح ہے کہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کوفہ کے گورنر وہاں موجود تھے اور ان کے سامنے یہ سب ہو رہا تھا۔ حضرت سعیدؓ نے اُن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ "میں کیا دیکھ نہیں رہا کہ اصحابِ رسولؐ پر آپ کے روبرو یہ سب وشتم ہو رہا ہے اور آپ اس پر کوئی نکیر و انسداد نہیں کرتے؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے (اور میں آنحضورؐ کی جانب ایسا قول منسوب نہیں کر سکتا جس پر آپ کل مجھ سے بازپرس کریں) کہ آپ فرماتے تھے کہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ ..... جنت میں ہوں گے"۔ حضرت سعیدؓ نے عشرۂ مبشرہ کے اسمائے گرامی گنوائے جن میں سے ایک آپ خود بھی تھے۔ یہ حدیث مسند احمد کے علاوہ تاریخ بخاری، اور ابن ماجہ میں بھی موجود ہے جیسا کہ علامہ احمد محمد شاکر نے اپنے محشیٰ نسخے کی جلد ۳، صفحہ ۱۰۹ پر واضح کیا ہے۔ پھر مسند احمد کے

اسی نسخے کے صفحہ ۱۱۰ اور صفحہ ۱۱۱ پر مزید تین احادیث درج ہیں جن میں ہے کہ خطب المغیرۃ بن شعبۃ فنال من علی (مغیرہؓ بن شعبہ نے خطبے میں حضرت علیؓ کی بدگوئی کی)، تو حضرت سعیدؓ بن زید نے انہیں وہیں ٹوکا اور فرمایا کہ "دس اصحاب عشرہ مبشرہ میں سے ایک علیؓ ہیں اور حیرت ہے کہ ان پر سب وشتم ہو رہا ہے" استاد شاکر جو محدثانہ طریق کے مطابق ہر حدیث کی سند پر بحث وتنقید کرتے ہیں، انہوں نے ان سب احادیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے۔

حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ اور حضرت سعیدؓ ابن زید تو خیر نہایت جلیل القدر صحابی تھے اور عشرہ مبشرہ[۱] میں سے تھے، اس لیے ان کے منصب ومرتبہ کا یہ ناگزیر تقاضا تھا کہ وہ اس مکروہ رسم کے خلاف صدائے احتجاج بلند فرماتے۔ لیکن یہ خیال کرنا بالکل غلط اور تاریخی تصریحات کے قطعی خلاف ہے کہ دوسرے سب لوگوں نے اس چیز کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیا تھا۔ مگر میں بوجوہ مزید تفصیلات ترک کر رہا ہوں۔ اہل عقل ودرایت کے لیے اتنی بحث بھی کفایت کرتی ہے۔

حضرت علیؓ پر سب وشتم کا یہ سلسلہ اگر حضرت علیؓ کی زندگی تک محدود رہتا اور آپ کی شہادت کے بعد ختم ہو جاتا تب بھی یہ کہا جا سکتا تھا کہ چلیے، جب آپ اپنے رب کے حضور میں پہنچ گئے تو ساری تلخیاں بھلا دی گئیں۔ مگر افسوس کہ یہ بُری رسم امیر معاویہؓ کے عہد اور اس کے بعد تک جاری رہی۔ چنانچہ حضرت سعدؓ کا جو واقعہ حدیث وتاریخ سے اوپر نقل ہوا ہے، وہ بھی حضرت علیؓ کی وفات کے بعد کا ہے، کیونکہ جنگ وجدال کے زمانے میں حضرت سعد سب سے الگ تھلگ عقیق میں انزوا پزیر ہو گئے تھے اور اس زمانے میں حضرت معاویہؓ کو بھی حرمین میں آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ البتہ حضرت حسنؓ سے صلح ہو جانے کے بعد امیر معاویہؓ حج کے لیے آئے اور مدینہ بھی تشریف لے گئے۔ اسی وقت حضرت سعدؓ سے بھی ملاقات ہوئی

---

[۱] عشرہ مبشرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ دس صحابہ کبار ہیں جنہیں آپؐ نے جنت کی خصوصی بشارت دی تھی۔ ان میں سے حضرت سعدؓ ان سات صحابہ کرام میں شامل ہیں جو سب سے پہلے اسلام لائے اور آنحضورؐ کے ہمراہ ہر غزوے میں شامل رہے۔ اسی طرح حضرت سعیدؓ بن زید بھی نہایت قدیم الاسلام صحابی اور مہاجرین اولین میں سے ہیں۔ آپ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی اور بہنوئی بھی تھے اور انہی کی تبلیغی مساعی سے حضرت عمرؓ داخل اسلام ہوئے۔

اور باہم سوال وجواب کی نوبت آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب علیؓ دنیا سے اٹھ گئے اور تلواریں نیام میں آ گئیں، اس وقت بھی جراحات اللسان کا انسداد نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب امیر معاویہؓ اور حضرت حسنؓ کے مابین مصالحت ہوئی ہے اور صلحنامہ لکھا جا رہا تھا تو حضرت حسنؓ نے ایک شرط یہ بھی لکھوائی کہ ہمارے سامنے برسرعام ہمارے والد محترم پر سب وشتم نہ ہو۔ چنانچہ امام ابن جریرؒ اپنی تاریخ (ج ۴، ص ۱۲۲) میں فرماتے ہیں:

صالح الحسن معاویة .... علی ان لا یشتم علی و ھو یسمع۔

حسنؓ نے معاویہ سے (علاوہ دیگر شرائط کے) اس شرط پر مصالحت کی کہ علیؓ پر سب وشتم نہ کیا جائے درآں حالیکہ میں اُسے سن رہا ہوں۔

ابن کثیرؒ نے البدایہ جلد ۸ صفحہ ۱۸ پر شرائط صلح میں سے ایک شرط یہ بیان کی ہے:

وان لایسبّ علی و ھو یسمع فاذا فعل ذالک نزل عن الامر۔

اور یہ کہ حضرت علی پر سب وشتم نہ کیا جائے جبکہ وہ (حضرت حسنؓ) اسے سن رہے ہوں۔ جب امیر معاویہؓ نے یہ شرط مان لی تو حضرت حسنؓ امارت سے دستبردار ہو گئے۔

ابن اثیرؒ نے الکامل میں ج ۳، صفحہ ۲۰۳ پر جو مزید تفصیل درج کی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت حسنؓ نے امیر معاویہؓ سے مطالبہ کیا کہ:

ان لایشتم علیاً فلم یجبہ الی الکف عن شتم علی فطلب ان لایشتم و ھو یسمع فاجابہ الی ذالک ثم لم یف بہ ایضاً۔

امیر معاویہؓ حضرت علیؓ پر سب وشتم نہ کریں۔ لیکن امیر معاویہؓ نے شتم علیؓ سے رکنے کا مطالبہ تسلیم نہ کیا۔ پھر حضرت حسنؓ نے یہ مطالبہ کیا کہ کم از کم امیر معاویہؓ ایسی حالت ہی میں سب و شتم نہ کریں جبکہ وہ (حسنؓ) سُن رہے ہوں۔ امیر معاویہؓ نے یہ بات مان لی لیکن انہوں نے یہ شرط بھی پوری نہ کی۔

ابن اثیرؒ کی روایت زیادہ جامع اور مفصل بھی ہے اور اس سے ابن کثیرؒ اور طبریؒ کی روایت سمجھنے میں مدد بھی ملتی ہے۔ طبریؒ اور ابن کثیرؒ مجملاً یہ بیان کرتے ہیں کہ صلحنامہ کی شرط یہ تھی کہ امام حسنؓ کو سُنا کر حضرت علیؓ پر سب وشتم نہ ہو۔ اور ابن اثیرؒ نے پوری تفصیل یہ بیان کی ہے کہ پہلے تو امام حسنؓ نے یہ مطالبہ کہ شتم علی کا کلیتہً

انسداد کیا جائے، لیکن امیر معاویہؓ نے اسے تسلیم نہ کیا تو امام حسنؓ نے اتنی بات منوانے پر اکتفا کیا کہ ان کے سامنے ہی کم سے کم ان کے والد ماجد کی بُرائی نہ ہو۔ امیر معاویہؓ نے اس شرط کو صلحنامے میں شامل کر لیا مگر اس کی پابندی نہ کی۔ محمد تقی صاحب جس طرح سبِ علیؓ کو ایک غیر واقعی مفروضہ بنا کر پیش کر رہے ہیں، اگر فی الحقیقت اسی طرح یہ ایک خیالی داستان تھی یا ایک آدھ فرد سے احیاناً انفرادی طور پر سب وشتم کا صدور ہوا تھا تو صلحنامے کی دستاویز لکھتے وقت حضرت حسن کی طرف سے اس مطالبہ کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور اگر یہ بات خلافِ واقعہ تھی تو کیوں نہ امیر معاویہ نے پلٹ کر فرمایا کہ ہم میں سے کون ہے جو اس فعل کا ارتکاب کرتا ہے؟
واقعہ یہ ہے کہ اکثر مؤرخین و محدثین نے سبِ علیؓ کا ذکر اسی انداز سے کیا ہے گویا کہ یہ ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے جس میں اختلاف نہیں۔ مثال کے طور پر ابن حجرؒ فتح الباری، کتاب المناقب میں حضرت علیؓ کے مناقب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ثم کان من امر علی ما کان فنجمت طائفۃ اُخری حاربوہ ثم اشتد الخطب فتنقصوہ و اتخذوا لعنہ علی المنابر سنۃ ووافقہم الخوارج علی بغضہ....

پھر حضرت علیؓ کے معاملہ میں پیش آیا جو کچھ کہ پیش آیا۔ پھر ایک دوسرا گروہ اٹھا جس نے آپ سے لڑائی کی۔ پھر ہنگامہ شدت اختیار کر گیا اور ان محاربین نے حضرت علیؓ کی عیب جوئی کی اور منبروں پر آپ کو لعن طعن کرنا اپنا طریقہ اور قاعدہ بنا لیا اور خوارج نے بغض علیؓ کے باعث اُن کی ہمنوائی کی۔

محاربین کے اس گروہ سے مراد صاف طور پر امیر معاویہؓ اور آپ کے ساتھی اور عاملین ہیں جو اس مہم میں سرگرم تھے۔ اب ان تمام حقائق و شواہد سے آنکھیں بند کر کے سبِ علیؓ کا سرے سے انکار کر دینا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ ایک مرتبہ مرزا حیرت دہلوی نے حادثۂ کربلا کا انکار اس دلیل کی بنا پر کر دیا تھا کہ امتِ محمدیہ کا کوئی فرد اپنے نبی کے نواسے کو قتل نہیں کر سکتا!
میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر مزید بحث ہو چکی اور سبِ علیؓ کے خلافِ واقعہ اور غیر ممکن الوقوع ہونے کے حق میں جو نقلی و عقلی استدلال عثمانی صاحب نے کیا ہے، اس کا جواب دیا جا چکا۔ تاہم یہ مناسب ہے کہ مولانا مودودی

کی پیش کردہ روایات پر جو تنقید کی گئی ہے، اس پر بھی کچھ کلام کیا جاتا ہے۔ ابن جریرؒ اور ابن اثیرؒ کی جو روایت مولانا نے نقل کی ہے، اس میں صراحت کے ساتھ یہ بات مذکور ہے کہ امیر معاویہؓ نے حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر بناتے وقت ہدایت کی کہ "علیؓ کی مذمت کرنے اور انہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا"۔ عثمانی صاحب جواب میں فرماتے ہیں کہ اِس روایت سے آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ حضرت مغیرہؓ صرف حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے لیے بددعا کرتے تھے۔ لیکن غور کیا جائے تو یہ بات صاف ہے کہ امیر معاویہؓ نے واضح الفاظ میں شتم علیؓ کا حکم دیا۔ اب اگر مغیرہؓ بن شعبہ نے اس کی تعمیل نہیں کی تو قابلِ ستائش ان کا فعل ہے نہ کہ امیر معاویہؓ کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سُننِ ابی داؤد اور مُسند احمد وغیرہ کی روایات کے بعد اس امر میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضرت مغیرہؓ خطبوں میں سب و شتم کرتے تھے۔ حضرت مغیرہؓ نے اگر کبھی نام لے کر حضرت علیؓ پر لعن طعن نہیں کی تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ آپ ایک مدبر انسان تھے۔ آپ ہر مرتبہ نام لے کر بُرائی نہیں کرتے ہوں گے، بلکہ بعض اوقات گول مول انداز میں امیر معاویہؓ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوں گے تاکہ وہ بھی راضی رہیں اور کوفہ، جو شیعانِ علی کا گڑھ تھا، وہاں کی گورنری میں ان کی عزت و آبرو بھی خطرے میں نہ پڑے۔ امیر معاویہؓ اور آپ کے طرفدار برملا حضرت علیؓ کو قاتلِ عثمانؓ کہتے تھے، اس لیے اِس پس منظر میں جب قاتلینِ عثمانؓ پر بددعا کی جائے گی تو آپ سے آپ حضرت علیؓ پر بھی چوٹ مقصود ہوگی اور بسا اوقات تعریض تصریح سے زیادہ کارگر اور مفیدِ مطلب ہوتی ہے۔

رُواۃ تاریخ کی بحث اس کے بعد محمد تقی صاحب نے دوسری اہم ترین بات کے نام سے راویوں کا ذکر چھیڑ دیا ہے کہ اس روایت کے راوی شیعہ، کذاب اور مجہول ہیں۔ عجیب بات ہے کہ جب سے خلافت و ملوکیت لکھی گئی ہے ہر شخص کتبِ رجال کے دفتر لے کر بیٹھ گیا ہے اور ایک ایک روایت کے راویوں کے حالات سنا رہا ہے کہ وہ ایسا تھا اور ایسا تھا۔ حتیٰ کہ یہ لے اتنی بڑھ گئی ہے کہ جن واقعات و روایات کو بعض حضرات خود اپنی کتابوں میں بلا تنقید نقل کر چکے ہیں، اب خلافت و ملوکیت میں انہی روایات کو دیکھ کر وہی حضرات ان میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ یہ مسئلہ اور یہ صورتِ حال متعدد پہلوؤں سے محتاجِ غور و فکر ہے۔ اس پر مفصل بحث تو مستقل مضمون ہی میں کی جا سکتی ہے، تاہم یہاں چند اشارات پیش کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اولین سوال جو اس سلسلے میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ راوی اگر ایسے ہی جھوٹے، لپاٹیے اور جعلے بھُنے شیعہ تھے

کہ ان کی تاریخی روایات بھی غلط اور ناقابلِ اعتماد تھیں تو ان جھوٹی روایات کو ہمارے ان مؤرخین نے کیوں اخذ کیا جو اہلِ سنت کے ائمۂ مورخین شمار ہوتے ہیں؟ اس کے جواب میں مدیر "البلاغ" اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ ان مؤرخین نے ہر روایت کی سند بیان کر کے یہ ذمہ داری ہم پر ڈال دی ہے کہ ہم جھوٹ سچ کا فیصلہ خود کرتے رہیں۔ یہ جواب متعدد وجوہ سے غلط اور ناقابلِ قبول ہے۔

پہلی وجہ یہ کہ یہ مؤرخین خود اعلیٰ پائے کے محدث اور فنِ رجال کے ماہر تھے۔ وہ ان راویوں کے حالات ہم سے ہزار درجہ بہتر جانتے تھے، بلکہ انہی میں سے بعض کی کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ فلاں راوی شیعہ تھا یا سُنی تھا، ثقہ تھا یا ضعیف تھا۔ ان مؤرخین سے یہ ارشادِ نبوی بھی مخفی نہ تھا کہ کفیٰ بالمرء کذباً ان یحدث بکل ماسمع (ایک آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ جو بات بھی سُنے اسے آگے بیان کر دے)۔ اب اگر ان راویوں کے بیان کردہ تاریخی واقعات سب کے سب جھوٹ کے پلندے تھے تو محض سند بیان کر کے یہ محدثین و مؤرخین جھوٹ کی اشاعت کے گناہ سے بری الذمہ کیسے ہو جائیں گے؟ انہوں نے تو ان جھوٹی خبروں کے سلسلۂ اسناد میں خود اپنے آپ کو بھی شامل کر لیا۔ اگر معاملہ پانچ، دس یا سو پچاس روایات کا ہوتا تو معاملہ دوسرا تھا، لیکن ان راویوں کے بیانات سے تو ہماری تاریخیں لبریز ہیں۔ ان ساری روایات کو جھوٹا قرار دینے کے بعد آخر ہم اپنے مؤرخین کی ثقاہت و دیانت کو کیسے بچا سکتے ہیں؟ ان مورخین کو چاہیے تھا کہ اول تو وہ تاریخ لکھنے ہی نہ بیٹھتے اور اس کارِ بے خیر میں اپنی عمریں نہ کھپاتے۔ اور بالفرض اگر انہیں یہ کام کرنا ہی تھا، تو پھر چاہیے تھا کہ جس طرح حدیثِ نبوی کے صحاح اور موضوعات کے مجموعے الگ الگ تیار کیے گئے تھے اسی طرح صحیح اور مکذوب تاریخی روایات کے مجموعے بھی وہ الگ الگ مرتب کر دیتے۔ ایسا ممکن نہیں تھا تو ہر روایت کے آخر میں اس کے صحیح یا سقیم ہونے کی وضاحت کر دی جاتی یا کم از کم کتاب کے شروع یا آخر ہی میں یہ تصریح کر دی جاتی کہ اس میں فلاں فلاں راویوں کی روایتیں ساقط الاعتبار ہیں۔ اگر ابتدائی مؤرخین نے یہ کام نہیں کیا تھا تو اس کے بعد جب یہ تاریخیں پوری امت میں شائع و ذائع ہوئیں اور دوسرے اہلِ علم تک پہنچیں، تو ان سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ اگر ان کے نزدیک ہی یہ سب جھوٹ کے طومار تھے تو وہ ہی ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے اور مسلمانوں کی ایک نسل سے دوسری نسل تک انہیں منتقل نہ

ہونے دیتے۔ ابن جریرؒ کے خلاف تشیّع کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اگرچہ بالکل بے جا ہی ہے تاہم اگر وہ شیعہ تھے تو کیا ابو حنیفہؒ دینوری، ابن اثیرؒ، ابن کثیرؒ، ذہبیؒ، ابن عبد البرؒ، ابن حجرؒ سبھی شیعہ تھے کہ وہ سب کم و بیش وہی روایات نقل کرتے چلے آئے جن کے خلافت و ملوکیت میں درج ہونے پر اتنی ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے؟ یہ بات بالکل مضحکہ خیز ہے کہ ایک طرف انہوں نے جھوٹی روایات سے اپنی کتابوں کا پیٹ بھر دیا اور دوسری طرف سند ساتھ لگا کر یہ کام دوسروں کے سپرد کر دیا کہ وہ جھوٹ اور سچ کے درمیان خود ہی امتیاز کرتے رہیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کتب تواریخ کا مطالعہ کرنا چاہے، وہ پہلے اپنے پاس لسان المیزان، تہذیب التہذیب، کتاب الجرح والتعدیل وغیرہ کی ضخیم مجلدات رکھے اور پھر ہر روایت کے رجال کی چھان بین ان کتابوں میں کرتا رہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتب رجال تحقیقِ حدیث کے لیے مدون کی گئی ہیں اور ان کی تجریحات کو تاریخی روایات اور ان کے راویوں پر چسپاں کرنا اصولاً صحیح نہیں۔

پھر یہ دعویٰ بھی خلاف واقعہ ہے کہ ان میں سے ہر مؤرخ نے اپنی تاریخ میں سند بیان کرنے کا التزام و اہتمام کیا ہے۔ ایک طرف ابن جریرؒ ہیں جو ہر روایت کی سند دیتے ہیں اور دوسری طرف ابو حنیفہ دینوری ہیں جو ابن جریر کے ہم عصر بلکہ ان سے متقدم ہیں[1]، وہ اپنی تاریخ "الاخبار الطوال" میں سند کا شاذ و نادر ہی ذکر کرتے ہیں بلکہ قال یا قالوا کہہ کر واقعہ بیان کرتے ہیں اور ان کی تاریخ نہایت مستند اور اہم ترین ماخذِ تاریخ شمار کی جاتی ہے۔ پھر مؤرخین متاخرین میں سے بہت سے ایسے ہیں (مثلاً ابن اثیر الجزری، ابن خلدون) جو سند کو بالعموم حذف کر دیتے ہیں۔ اب ان کی روایات کی سند کس طرح جانچی جائے گی؟ یا ان کتابوں کو دریا برد کر دیا جائے گا؟ میں یہاں ایک مثال پیش کر کے وضاحت مدعا کرتا ہوں۔ مولانا مودودی کی نقل کردہ زیر بحث روایت کا ایک راوی ابو مخنف ہے جسے ابنِ عدیؒ کے حوالے سے محقق صاحب نے غالیًا شیعہ قرار دیا ہے۔ مولانا مودودی کے دوسرے بہت سے ناقدین نے بھی اس راوی کو بے تحاشا گالیاں دی ہیں۔ اب حال یہ ہے کہ ابن جریرؒ کی دو درجن کی تاریخ کا تقریبًا اسّی نوّے فی صد حصّہ

---

[1] ابن جریرؒ کا سن ولادت ۲۲۴ھ اور سن وفات ۳۱۰ھ ہے جبکہ ابو حنیفہ دینوری سنہ ۲۱۰ھ یا چند سال قبل پیدا ہوئے اور سنہ ۲۸۲ھ میں فوت ہوئے۔

آخر یہ کیا قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی ہے کہ ایک ہی راوی کی روایت اگر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب بیان فرمائیں تو سر آنکھوں پر اور اگر مولانا مودودی بیان کریں تو انہیں رجوع اور توبہ کے مشورے دیئے جائیں؟ اس کے جواب میں محمد تقی صاحب شاید یہی کہیں گے کہ مولانا مودودی کی روایت سے امیر معاویہؓ پر سبّ وشتم کا الزام آتا ہے۔ مگر یہ عجیب لطیفہ ہے کہ اسی روایت کے آخری حصے سے آپ خود حضرت معاویہؓ کی اس الزام سے براءت ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ امیر معاویہؓ نے صرف قاتلینِ عثمانؓ پر لعنت کی ہدایت کی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس روایت کے راوی بغضِ معاویہ میں جل بھن کر خاکستر ہو چکے تھے تو انہوں نے روایت کے آخری حصے میں وہ بات کیسے بیان کر دی جو آپ کے خیال میں پہلے حصے کی تردید کر رہی ہے اور الزامِ شتم کو کمزور بنا رہی ہے؟ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ راوی از اوّل تا آخر ایسی روایت گھڑتے جس سے آپ براءتِ معاویہؓ کا کوئی پہلو نہ نکال سکتے[1]۔ ان راویوں نے تو بڑا کرم کیا کہ حضرت مغیرہؓ کے فعل سبّ کو اُس واشگاف انداز میں بیان کیا جس طرح ابوداؤد اور مسند احمد کے ثقہ اور سنّی راویوں نے بیان کیا ہے۔

اب میں مولانا مودودی کی نقل کردہ دوسری روایت کو لیتا ہوں جس میں مذکور ہے کہ مروان جب امیر معاویہ کی طرف سے مدینے کا گورنر تھا تو وہ ہر جمعہ کو حضرت حسنؓ کے سامنے منبر پر سبِّ علیؓ کا ارتکاب کرتا تھا۔ محمد تقی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ روایت البدایہ والنہایہ کے اصل مصری نسخے میں موجود نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس میں لکھا ہے کہ مروان کا انتقال طائف میں ہوا[2] حالانکہ اس کی وفات مدینہ یا دمشق میں ہوئی اور اس روایت

---

[1] مولانا مودودی کے تمام ناقدین کا یہی حال ہے کہ وہ تردید میں جو روایات پیش کرتے ہیں وہ بھی بالعموم انہی مجروح راویوں کی ہوتی ہیں۔ اس وقت یہ حضرات یا تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں مؤرخ یا راوی شیعہ ہے مگر نسبتہً معتبر ہے اس لیے اس کی روایت قابلِ قبول ہے۔ یا راوی کے ذکر کو حذف کر دیتے ہیں۔ اگر یہ راوی جھوٹے ہیں تو ان کی ہر روایت مکذوب اور ناقابلِ استناد ہونی چاہیے۔

[2] روایت میں مروان کا نہیں بلکہ اس کے باپ حکم کا طائف میں مرنا مذکور ہے۔ عبارت یہ ہے و قد کان ابوہ الحکم من اکبر اعداء النبیؐ و انما اسلم یوم الفتح و قدم المدینۃ ثم طردہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی الطائف ومات بھا۔

کتاب الفتن میں فرماتے ہیں: "وقد وردت احادیث فی لعن الحکم والد مروان وما ولد، اخرجہما الطبرانی وغیرہ"۔

عثمانی صاحب نے بخاری کی ایک روایت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ "مروان کے سب و شتم کی حقیقت بس اتنی تھی کہ وہ حضرت علیؓ کو ابو تراب کہتا تھا جس کے معنی ہیں مٹی کا باپ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محبت میں اس نام سے پکارتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہوگا"۔ لیکن یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے۔ امام بخاریؒ کا یہ عام قاعدہ ہے کہ وہ ہر مقام پر حدیث کو تمام بیان نہیں کرتے، بلکہ ترجمۃ الباب کی مناسبت سے جس مسئلے یا فقہی جزیئے کو حدیث سے مستنبط کرنا چاہتے ہیں، صرف اتنا ٹکڑا متن میں لاتے ہیں۔ یہاں بھی چونکہ اصل مسئلہ حضرت علیؓ کے مناقب کا اثبات ہے اس لیے امام بخاریؒ نے حدیث کا صرف وہ حصہ روایت کیا ہے جس سے حضرت علیؓ کی منقبت ثابت ہوتی ہے۔ تاہم عثمانی صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ مروان ابو تراب سے بس "مٹی کا باپ" مراد لیتا تھا۔ عربی میں ابو کا لفظ بطور مضاف صرف باپ کے معنی میں نہیں آتا، "والے" کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ابو ہریرہؓ کے معنی بھی بلی کے باپ نہیں بلکہ بلی والے کے ہیں۔ مروان طنزاً اس لفظ کو خاک آلود کے معنی میں استعمال کرتا تھا۔ بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کے حامیوں کو بھی امیر معاویہؓ کے گورنر اور ساتھی ترابیہ کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت حُجرؓ بن عدی کے خلاف جب کوفے کا گورنر زیاد بغاوت کا مقدمہ بنا رہا تھا تو اس نے جو خط امیر معاویہؓ کو اس سلسلے میں لکھا اُسے تاریخ طبری، جلد ۴، صفحہ ۲۰۱ پر نقل کیا گیا ہے۔ اس میں یہ الفاظ موجود ہیں:

ان الطواغیت فی ھٰذہ الترابیۃ السابئیۃ رأسھم حجر بن عدی، خالفوا امیر المؤمنین۔	اس ترابیہ سبائیہ گروہ کے طاغوتوں نے، جن کا سردار حُجر بن عدی ہے، امیر المومنین کی مخالفت شروع کر رکھی ہے۔

ظاہر ہے کہ زیاد کا یہ خط جو بالآخر حُجرؓ بن عدی کے قتل کا محضر نامہ ثابت ہوا، اس میں اُن کے لیے ترابیہ کا لفظ (اور وہ بھی سبائیہ کے ساتھ) نہ تعریفی جملہ ہو سکتا ہے، نہ اس سے فقط لغوی معنی مراد ہو سکتے ہیں بلکہ

اسے یقیناً تحقیر آمیز مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب خاک آلودہ اور خائب و خاسر ہونا ہے[1]۔

مروان اور بنو مروان کا یہ توہین آمیز رویہ اہلِ بیت ہی تک محدود نہ تھا۔ وہ حضرت اسماءؓ کو بھی ذ ود کمربندوں والی، ذات النطاقین کے نام سے اس لیے پکارتے تھے کہ اس سے ان کی تذلیل و تخفیف ہو۔ اس کے جواب میں حضرت اسماءؓ بھی فرماتی تھیں کہ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ یہ لفظ (ذات النطاقین) تو وہ لقب ہے جو مجھے اس لیے عطا کیا گیا تھا کہ میں نے اپنا کمربند پھاڑ کر دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ میں ایک ٹکڑے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا توشہ دان ڈھانپ دوں اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور میرے والد حضرت ابوبکرؓ ہجرت کر کے مکہ چھوڑ رہے تھے۔ یہ قصہ صحاح کی متعدد احادیث میں مروی ہے۔

میرا خیال ہے کہ سبِ علیؓ کی بحث طویل ہو گئی اس لیے میں اسے ختم کر رہا ہوں۔ البتہ آخر میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا مودودی نے اگر حضرت معاویہؓ کے بعض اعمال پر بدعت کا اطلاق کیا ہے تو وہ اس میں تنہا نہیں۔ دوسرے بعض حضرات جنہوں نے قریب کے دور میں اس موضوع پر لکھا ہے، وہ بھی اس اندازِ تعبیر سے نہیں بچ سکے۔ مثال کے طور پر مولانا معین الدین صاحب ندوی، سیر الصحابہ، جلد ششم کے صفحہ ۹۳ پر امیر معاویہؓ کے متعلق لکھتے ہیں: "جناب امیرؓ کے مقابلہ میں ان کا صف آرا ہونا، اور اس میں کامیابی کے لیے ہر طرح کے جائز و ناجائز وسائل استعمال کرنا، حضرت حسنؓ سے لڑنا، اسلامی خلافت کو موروثی حکومت میں بدل دینا وغیرہ، ان میں سے ہر ایک واقعہ ان کی ایسی کھلی غلطی ہے جسے کوئی حق پسند مستحسن قرار نہیں دے سکتا خصوصاً یزید کی ولی عہدی سے اسلامی خلافت کی رُوح ختم اور اسلام میں موروثی بادشاہت کی رسم قائم ہو گئی۔ ان

---

[1] یہاں یہ واقعہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت حُجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو جب موت کی سزا سنائی گئی تو ان کے سامنے امیر معاویہؓ کے ایلچی نے یہ پیش کش کی کہ اگر وہ علیؓ پر لعنت و تبرا کریں تو ان کی جان بخشی ہو سکتی ہے۔ مگر ان سب نے انکار کر دیا اور سزائے موت نافذ کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امیر معاویہؓ کے خلاف بغاوت کے جرم سے زیادہ سنگین جرم اُن کا سبِ علیؓ سے انکار تھا۔ مولانا مودودی نے آگے چل کر "آزادیٔ رائے کے خاتمہ" کے زیرِ عنوان اس واقعہ کو بیان کیا ہے اور تاریخی کتابوں کے حوالے دیئے ہیں مگر اس واقعہ کا حوالہ سب و شتم کے ضمن میں نہیں دیا، حالانکہ اس واقعہ سے سبِ علیؓ پر لوگوں کو مجبور کرنے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

واقعات نے عوام چھوڑ حق پسند خواص کو بھی امیر معاویہؓ سے بدظن کر دیا۔ پھر ص ۱۲۷ پر لکھتے ہیں: "امیر معاویہ کی بدعات میں اسلامی خلافت کو شخصی و موروثی حکومت بنا دینے کی بدعت تو بے شک نہایت مذموم بدعت تھی جس نے اسلامی خلافت کی روح مردہ کر دی۔" اسی طرح ص ۹۲ پر لکھتے ہیں "ابن عم رسول، خلیفۂ راشد علی مرتضیٰؓ اور امیر شام کا مقابلہ ہی کیا؟ ع چراغِ مردہ کجا شمعِ آفتاب کجا!" یہ امر قابلِ وضاحت ہے کہ اس کتاب میں مولانا معین الدین صاحب نے حضرت معاویہؓ کے خلاف اعتراضات کا ہر ممکن طریق پر دفاع کیا ہے، اس کے باوجود مذکورۂ بالا کلمات بے اختیار ان کی نوکِ قلم پر آگئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جو شخص بھی اشخاص و افراد کی بہ نسبت دین کی حقیقی قدروں کو عزیز تر رکھے گا وہ ہر اس فعل کو بدعت کہے گا جو خلافِ کتاب و سنت ہو، خواہ اس کا صدور کسی سے بھی ہو۔ وہ "حضرتوں" اور "غیر حضرتوں" کے لیے دو الگ الگ پیمانے لے کر نہیں بیٹھ جائے گا کہ کسی غیر حضرت سے ایسا کوئی فعل سرزد ہو تو اسے بے تکلف بدعت قرار دے دے، اور جب کسی "حضرت" سے ایسا ہی کوئی فعل صدور میں آئے تو اسے اجتہاد ثابت کرے تاکہ اس پر کم از کم ایک اجر کے تو وہ ضرور ہی مستحق قرار پائیں۔

مدیر "البلاغ" نے چونکہ سبِّ علیؓ والے الزام کی بڑے زور شور سے تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ "خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا ہے" اس لیے میں چاہتا ہوں کہ سب سے آخر میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا ایک ارشاد بھی آپ کی تالیف "حکایات الاولیاء" سے نقل کر دوں۔ اس کتاب کے ص ۱۲۴ پر لکھنؤ کے ایک وعظ کے دوران میں شاہ اسمعیل شہیدؒ اور ایک شیعہ سبحان علی خاں کا ایک سوال و جواب یوں منقول ہے:

> "اثنائے وعظ میں ایک موقع پر حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہما کا ذکر آیا تو سبحان علی خاں پھر بولا اور اس نے حضرت علیؓ کی شان میں زبانِ مدح اور امیر معاویہؓ نیز دوسرے صحابہ کی شان میں زبانِ تنقیص کھولی تو مولانا شہیدؒ پھر کھڑے ہو گئے اور مولانا عبدالحی صاحب کو وعظ سے روک کر سبحان علی خاں سے کہا کہ بتاؤ حضرت علیؓ کے دربار میں امیر معاویہؓ پر تبرا ہوتا تھا؟ اس نے کہا نہیں حضرت علیؓ کا دربار ہجو گوئی سے پاک تھا۔ پھر پوچھا کہ حضرت

معاویہؓ کے یہاں حضرت علیؓ پر تبرا ہوتا تھا؟ کہا کہ بے شک ہوتا تھا۔ اس پہ مولانا شہیدؒ نے فرمایا کہ اہلِ سنت الحمدللہ حضرت علیؓ کے مقلد ہیں اور روافض حضرت معاویہؓ کے"۔

اب اگر میں عثمانی صاحب کے الفاظ مستعار لے لوں تو مجھے بھی یہی کہنا چاہیے کہ خدا ہی جانتا ہے کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ نے حضرت معاویہؓ پر یہ الزام کس بنیاد پر کس دل سے عائد کیا، اور پھر مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے لیے یہ کیونکر ممکن ہوا کہ اس الزام کو اپنے قلم سے نقل فرما کر اس کی تائید و توثیق کر دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ کے جن اقدامات کے حق میں کتاب اللہ، سنتِ رسول اور سنتِ خلافتِ راشدہ سے کوئی دلیل یا سند پیش نہیں کی جا سکتی، ان افعال کو خلافِ کتاب و سنت کہنے یا ان پر بدعت کا اطلاق کرنے میں اہلِ سنت کے ہاں کوئی امر مانع نہیں ہے کیونکہ اہلِ سنت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کو ان معنوں میں معصوم نہیں سمجھتے ہیں، جس طرح اہلِ تشیع اپنے اماموں کو معصوم عن الصغائر والکبائر سمجھتے ہیں۔ موطا امام مالک، کتاب الزکوٰۃ میں جو روایات مروی ہیں، ان میں مذکور ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ جب کسی شخص کو کوئی عطیہ یا وظیفہ دیتے تھے تو لینے والے سے پوچھتے تھے کہ اس کے پاس ایسا مال پہلے سے تو موجود نہیں ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو واجب الادا زکوٰۃ عطیے میں سے وضع کر لی جاتی تھی، ورنہ پورا عطیہ دے دیا جاتا تھا۔ پھر امام مالک امام زہریؒ سے روایت کرتے ہیں۔ اول من اخذ من الاعطیۃ الزکوٰۃ معاویۃ (معاویہؓ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عطیات کی زکوٰۃ بھی پیشگی لینی شروع کر دی)۔ اس پر شاہ ولی اللہ صاحب مصفّٰی میں فرماتے ہیں: گرفتن زکوٰۃ در وقتے کسے را سالانہ و ماہانہ دادہ شود بدعت است و سنت آنست کہ بعد از انقضائے حول از دستِ صاحب مال باید گرفت (سالانہ و ماہانہ مشاہرہ دیتے وقت کسی سے اس پر زکوٰۃ لینا بدعت ہے اور سنت یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد صاحب مال سے زکوٰۃ لی جائے)۔ یہاں یہ بات بھی قابل وضاحت ہے کہ بعض فقہاء کے ہاں پیشگی زکوٰۃ کی ادائیگی حدِ جواز میں آ سکتی ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور خلفائے راشدین میں چونکہ یہ طریقہ متعارف نہ تھا کہ ہر شخص کو بیت المال سے رقم ادا کرتے وقت لازماً پیشگی زکوٰۃ وصول کی جائے، اس لیے امیر معاویہؓ کے فعل کو شاہ صاحب نے بدعت قرار دیا۔ (باقی)

ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ حالت

دورۂ ترکی کے مشاہدات

(جناب خلیل حامدی صاحب)

(۶)

محمد الفاتح کی جامع اور درسگاہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آج کی افطاری بھی مدرسہ امام و خطیب میں تھی۔ موفاق ملی برائے ترک طلبہ کے مرکز سے ہم سیدھے مدرسہ امام وخطیب روانہ ہو گئے۔ ہماری موٹر رواں دواں جا رہی تھی کہ استنبول کی بلدیہ کے پاس پہنچ گئے۔ اور کچھ فاصلہ آگے چلے ہوں گے کہ نائف آفندی نے سڑک کے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ جامع محمد الفاتح ہے۔ اس جامع کو اندر سے دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ گو جی چاہتا تھا کہ جو شخصیت تاریخ میں استنبول کی روحِ رواں رہی ہے اُس کی اپنے نام سے تعمیر کردہ مسجد کے خدوخال کی بھی زیارت ہو جائے، مگر وقت کی تنگی آڑے آئی۔ البتہ مسجد کی ملحقہ عمارات اور حدود اربعہ پر طائرانہ نگاہ ڈالنے کا موقع نکال ہی لیا۔ اس مسجد کا خصوصی وصف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک بہت بڑی تعلیمی درسگاہ بھی تھی۔ اس درسگاہ کی عمارتیں اب بھی موجود ہیں اور کسی بہت بڑی یونیورسٹی کا پتہ دیتی ہیں۔ آستانۂ خلافت میں اس درسگاہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ محمد الفاتح محض صاحب سیف و سنان ہی نہ تھا، علم و ادب کا قدردان بھی تھا۔ اپنی مسجد کے ساتھ اس نے علم و ادب کی اعلیٰ درسگاہ قائم کر کے اسلامی تاریخ کے ان حکمرانوں کی مثال قائم کی جن کے ایک ہاتھ میں دستۂ علم تھا اور دوسرے ہاتھ میں دفترِ علم۔ مگر اب درسگاہ محمد الفاتح ویرانہ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ صرف خالی عمارتیں باقی ہیں۔ جب ایا صوفیا کو میوزیم بنایا گیا تھا (۱۹۳۱ء اور ۱۹۳۲ء) تو جامع محمد الفاتح کو گودام بنا دیا گیا۔ یہ زیادتیاں کسی غیر مسلم فاتح سے تو متوقع ہو سکتی ہیں لیکن ایک مسلمان ملک میں ان کا ارتکاب مصطفیٰ کمال کے عہد میں کیا گیا! ایا صوفیا کو مسجد سے میوزیم میں تبدیل کرنے کی وجہ تو پھر بھی یہ ہو سکتی تھی کہ مسیحی اقوام

کو راضی کرنا مقصود تھا۔ مگر مسجد محمد الفاتح کو کس کی رضا جوئی کے لیے گودام بنایا گیا۔

عمل پسند قوم مدرسہ امام و خطیب میں کل کی طرح آج بھی افطاری پر گروہِ کثیر جمع تھا۔ افطاری کے بعد حسب معمول تقریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آج بھی مجھے تقریر کے لیے مجبور کیا گیا۔ پہلے تو تقریر کی دعوت میرے لیے "بلائے ناگہانی" تھی مگر اب یہ کیفیت ہو گئی کہ جونہی چھوٹے یا بڑے اجتماع کا سامنا ہوا، ذہن نے یہ سمجھ کر کوئی نہ کوئی موضوع تراشنا شروع کر دیا کہ ترک بھائی تقریر کے بغیر معاف نہیں کریں گے۔ لیکن معاملہ اگر محض تقریر اور سخن سازی پر مل سکتا ہو تو بھی قابلِ برداشت ہے۔ اور انسان محض مخلص کی تدبیر کر سکتا ہے۔ مگر یہاں ہندوستان اور پاکستان کی طرح چرب زبانی سے کام لینا اور لچھے دار تقریر جھاڑ دینا مشکل میں بھی مبتلا کر سکتا ہے۔ ترک قوم آج کل کے عربوں کی طرح باتونی نہیں ہے بلکہ عملی قوم ہے۔ ترکوں کے سامنے اگر مؤثر تقریر کر دی جائے تو ان کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ فوراً عمل کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ ترک طبعاً ایسے علم الکلام سے واقف نہیں ہیں جس کی تان زبان و بیان پر ٹوٹ جاتی ہو، بلکہ وہ صرف اس علم الکلام کو جانتے ہیں جس کے قلابے گرز و میدان سے ملے ہوئے ہوں۔ راقم الحروف کو ترکوں کی عمل پسندی کا ایک واقعہ یاد ہے۔ ہمارے ایک عرب دوست استاذ محمود مہدی استانبولی بڑے صاحبِ جذبہ آدمی ہیں۔ دمشق کے ماہنامہ "التمدن الاسلامی" کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں۔ اسی رسالے میں انہوں نے اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ حج کے زمانے میں انہوں نے حاجیوں کے بحری جہاز کے اندر لاؤڈ اسپیکر پر تقریر کی۔ حجاج کے اندر ترکوں کی ایک جماعت بھی موجود تھی۔ تقریر میں انہوں نے دنیائے اسلام کی حالتِ زار اور بالخصوص المیۂ فلسطین پر وضاحت سے روشنی ڈالی اور تمام حاضرین سے اور علی الخصوص ترکوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالیں کہ وہ اسرائیل کے ساتھ قطعاً تعاون نہ کریں، کیونکہ اسرائیل سے تعاون کرنا اسلام کے منافی ہے۔ جہاد کی ضرورت پر بھی انہوں نے زور دیا۔ اس تقریر کے بعد انہوں نے اپنے ایک ترکی دان ساتھی سے کہا کہ وہ اس تقریر کا ترکی ترجمہ پیش کریں۔ چنانچہ ان صاحب نے بڑے مؤثر اور جذبہ انگیز انداز میں ترک حجاج کے سامنے تقریر کا ترجمہ پیش کیا۔ تقریر سن کر تمام ترک حاجی مترجم کے گرد جمع ہو گئے اور اس سے کہا کہ جب ہم نے اپنے وطن سے کوچ کیا تھا تو ہم یہ وصیت کر آئے تھے کہ واپس نہیں آئیں گے۔ یا حضرت مولانا چلیے، ہم آپ کی

قیادت میں جہاد کریں گے"۔ یہ رنگ دیکھ کر مترجم کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ کہنے لگے: "محمود صاحب آپ نے مجھے سخت مشکل میں پھنسا دیا۔ میں تو سمجھا تھا کہ معاملہ صرف ایک تقریر کر دینے کا ہے۔ اور یہ لوگ تو سچ مچ لڑنے مرنے پر اُتر آئے ہیں اور بات سنجیدگی اختیار کر گئی ہے۔ ترک قوم تو مذاق اور زبان آرائی نہیں جانتی"[1]۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ محمود صاحب اور اُن کے ساتھی نے ترک حاجیوں سے کس طرح جان بخشی کروائی۔ مگر یہ واقعہ ترکوں اور عربوں دونوں کے ملی کردار کا عکس پیش کرتا ہے۔

اسلامی تعلیم کا شوق راقم الحروف نے افطاری کے بعد مختصر تقریر کی۔ اس مرتبہ ترجمانی کے فرائض الٰہیات فیکلٹی کے ایک پروفیسر صاحب نے سرانجام دیے۔ نام تو اُن کا یاد نہیں رہا مگر موصوف ازھر یونیورسٹی (قاہرہ) کے گریجویٹ ہیں اور نہایت فصیح اور شستہ عربی میں گفتگو کرتے ہیں۔ اُن کا یہ فقرہ ابھی تک میرے دل پر نقش ہے کہ "ترکوں کے اندر اسلامی شعور از سرِ نو ابھر پڑا ہے"۔ مترجم چونکہ عربی دان تھا اس لیے میں نے تقریر بھی عربی زبان میں کی۔ میں کل سے سُن رہا تھا کہ مدارس امام و خطیب کے فارغ شدہ طلبہ کو تکمیلِ تعلیم میں بڑی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ الٰہیات فیکلٹی ایک محدود تعداد سے زیادہ طلبہ کو نہیں لیتی جب کہ ہر سال ان مدارس سے ہزارہا کی کھیپ فارغ ہو رہی ہے۔ دوسرے کالجوں کے دروازے بھی ان پر بند ہیں۔ حالانکہ ذہنی اور علمی استعداد کے لحاظ سے یہ طلبہ گورنمنٹ کے سیکولر اسکولوں کے طلبہ کی نسبت بہت بلند تر ہیں اور اسی "شوخ طبع" کی وجہ سے ملک کی سرکاری یونیورسٹیاں انہیں لینے سے گریز کر رہی ہیں[2]۔ میں نے اپنی تقریر میں پاکستان کے نظامِ تعلیم پر روشنی ڈالی اور پاکستان میں اسلامی تعلیم اور پاکستانی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اسلامیات کے حدود اربعہ بیان کیے۔ یہ اشارہ بھی کر دیا کہ پاکستان میں اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے مواقع موجود ہیں اور پاکستانی مسلمان ترک طلبہ کا خیر مقدم

---

[1] ماہنامہ التمدن الاسلامی، دمشق۔ ج ۳۴ شمارہ اپریل ۱۹۶۷ء

[2] ان مدارس کی تنظیموں اور حکومت کے درمیان مدت سے جھگڑا چل رہا تھا۔ ان تنظیموں کا مطالبہ تھا کہ مدرسہ امام و خطیب کے فارغ شدہ طلبہ کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ وہ جس کالج میں چاہیں داخلہ لے سکیں اور اگر حکومت کو ان کی صلاحیتوں میں کچھ شبہ ہو تو وہ دوسرے طلبہ کے ساتھ ان طلبہ کا امتحانی مقابلہ کرا سکتی ہے۔ میں ترکی ہی میں تھا کہ یہ خبر مل گئی کہ حکومت نے مدارس امام و خطیب کی تنظیموں کا مطالبہ تسلیم کر لیا ہے اور اب وہ ہر کالج میں داخلہ لے سکتے ہیں۔

کریں گے۔ تقریر کے بعد میں بھی اسی مشکل میں پھنس گیا جس میں دمشق کے محمود مہدی استانبولی اور ان کے ساتھی پھنس گئے تھے۔ مدرسہ امام و خطیب کے نہ صرف طلبہ کی ایک تعداد بلکہ بعض اساتذہ تک بھی پاکستان جانے کے لیے تل گئے بلکہ پا بہ رکاب ہو گئے۔ ان کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کو دیکھ کر راقم الحروف کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دل نے یہ آہِ سرد کہا اے کاش! پاکستان ان شیروں اور شیر زادوں کو فراخ دلی سے اپنے ہاں جگہ دینے کے لیے تیار ہوتا اور یہ اکتسابِ علم کے لیے پاکستان کے دروازے بے تکلف کھلے ہوئے پاتے۔ ترکوں نے قرنوں اسلام اور ملّتِ اسلامی کی پاسداری کی ہے۔ اب کچھ تو اس احسان مندی کا لحاظ ہو۔ طلبا و اساتذہ نے مجھے بتایا کہ "اگر ہم مغربی ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لیے جائیں تو ہمیں ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں لیکن اگر ہم اسلامی ممالک میں تعلیم کے لیے اور بالخصوص اسلامی تعلیم کے لیے جانا چاہیں تو ہزاروں موانع سامنا کرتے ہیں" ترکوں ہی پر کیا موقوف جو مسلمان بھی زہرِ ہلاہل کو قند کہنے سے انکار کرے گا ایسی رکاوٹوں سے دوچار ہوگا۔

مغرب کی نماز پڑھی تو یوسف صالح ترجہ بھی آ گئے۔ مدرسہ امام و خطیب کے پرنسپل صاحب نے پیشکش کی کہ میں مدرسہ کی عمارت اور نظام کو دیکھوں۔ پیاسے کو آبِ زلال کی پیشکش مل گئی۔

مدرسہ امام و خطیب کی تفصیلات مدرسہ امام و خطیب کی یہ عمارت محمد الفاتح کی مسجد کے قریب ہے۔ یوسف صالح ترجہ کے الفاظ میں "جامع محمد الفاتح کا قرب مدرسہ امام و خطیب کے طلبہ کو اپنے شاندار ماضی کی یاد دلاتا رہتا ہے"۔ یہ عمارت پانچ منزلہ ہے اور جدید ترین طرز پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۱۱ سو میٹر ہے ایک ہزار تین سو طلبہ ہیں اور ۵۰ اساتذہ ہیں۔ مدرسہ کا اپنا شفاخانہ ہے۔ لائبریری، دار المطالعہ اور مطبخ کا نظام معیاری ہے۔ درسگاہیں نہایت صاف اور پُرسکون ہیں۔ طلبہ کے لیے نشستوں کا انتظام جدید تقاضوں کا عکاس ہے۔ ہوسٹل صفائی اور نظم اور سلیقہ کے لحاظ سے قابلِ تعریف ہے۔ بستروں اور آہنی چارپائیوں کی یکسانیت قابلِ دید ہے۔ ضرورت مند طلبہ کے لیے لباس، نصابی کتب اور طبّی امداد مفت مہیا کی جاتی ہے دوسری منزل پر ایئر کنڈیشنڈ مسجد ہے۔ نماز باجماعت اور تجوید و قرأت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ہوسٹل کے ہر حصے میں ایک نگران مقرر ہے جو طلبہ کے نظم و نسق کا ذمہ دار ہی نہیں ان کی اخلاقی اور معاشرتی تربیت کا ذمہ دار بھی ہے۔ مطبخ جدید ترین سامان سے لیس ہے۔ برتن خوش ذوقی کا آئینہ اور کھانے کی

میزیں اور اُن کی ترتیب عسکری رُعوج سے لبریز۔ کھانے کی تیاری کے لیے باتنخواہ طباخ اور تقسیم کیلئے طلبہ کی باری باری ڈیوٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ غسل خانوں اور طہارت خانوں کی افراط ہے طلبہ کو اساتذہ سے عقیدت اور اساتذہ کو طلبہ سے محبت اور دونوں مدرسۂ امام و خطیب کی ترقی و عروج کے طلبگار۔ یوسف صالح قرجہ نے بتایا کہ اس مدرسہ میں طلبہ کے اندر کبھی دنگا فساد نہیں ہوا۔ چوری اور خیانت کے حادثات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ایثار و اخوت کی بھرپور فضا اور تلاوتِ قرآن کی کثرت دلوں کو نصب العین سے ہمہ وقت مربوط رکھتی ہے۔ شہر کے مسلمان بھی ان طلبہ کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے کے بجائے عزت و احترام سے پیش آتے ہیں۔ اور انہیں مستقبل کی امید گردانتے ہیں۔ میرے ایک ساتھی عبدالقادر سیزگین اس مدرسہ کے فارغ ہیں۔ مختلف کلاسوں سے ہوتے ہوئے جب ہم اُن کے کلاس روم میں پہنچے جہاں وہ خود مدرسہ کی تعلیم کا آخری سال گزار چکے ہیں تو وہ بے محابا اپنی نشست کی طرف لپکے اور پرانی یاد تازہ کرنے کے لیے وہاں جا بیٹھے۔ ۲۵ سال کا یہ باریش نوجوان نشست پر بیٹھتے ہی اشکبار ہو گیا۔ اس کے یہ آنسو خوشی کے آنسو تھے "اے میری پیاری درسگاہ، خدا تجھے ہرجہت ترقی سے ہمکنار کرے۔ تُو نے مجھے دین سے آشنا کیا۔ مادہ پرستی کے سیلاب کے اندر مجھے روحانی لذت سے آشنا کیا۔ اے میرے پیارے بنچ، اے میرے محبوب ڈیسک، اے میری نگاہوں کے مرکز تختۂ سیاہ، اے زمین، اے چھت، مَیں تمہارا احسان اور تمہاری محبت کبھی فراموش نہیں کر سکتا"۔ عبدالقادر سیزگین بے خود تھے۔ نائف آفندی نے اُن کے کندھے پر ہاتھ ملتے ہوئے کہا کہ "آفندم ہمیں جلدی ہے۔ یہ عثمانی تھیٹر نہیں ہے۔ پھر کبھی دل کی بھڑاس نکال لیجیے"۔ عبدالقادر سیزگین عثمانی تھیٹر میں کام کرتے ہیں۔ اس تھیٹر میں عثمانیوں کی تاریخ اسٹیج کی جا رہی ہے۔ عثمانیوں سے محبت و عقیدت کے اظہار کے لیے ترک نوجوان گوناگوں اور بوقلموں طریقے ایجاد کر رہے ہیں۔ یوسف صالح قرجہ اور دوسرے احباب کی معیت میں مدرسۂ امام و خطیب کے اہم حصوں اور شعبوں کو دیکھا۔ لائبریری میں کچھ دیر استراحت کی اور کتابوں کا جائزہ لیا۔ زیادہ تر کتابیں لاطینی رسم الخط میں ہیں۔ عربی رسم الخط کے بھی کچھ نسخے ہیں۔ عربی زبان میں تفسیر اور حدیث کی چند کتابیں بھی موجود ہیں۔ ایک ثانوی اسکول کی لائبریری کے لیے جس طرح کے ذخیرۂ کتب کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی حد تک مہیا ہے۔ اس سے استفادہ کرنے والے زیادہ تر

اساتذہ ہیں۔ لائبریری کے انچارج نے بتایا کہ طلبہ کو لائبریری سے استفادہ کے لیے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ مولانا مودودی مدظلہ العالی کی کتابوں کے ترکی تراجم بھی لائبریری میں موجود ہیں۔

مذہبی تعلیم کا آغاز کب ہوا اتنا بڑا ادارہ حکومت کی امداد پر نہیں بلکہ عامۂ مسلمین کی امداد پر چل رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء تک تو ترکی میں "مذہب کی دیکھ بھال" حکومت کا محکمۂ امورِ مذہبی کرتا تھا۔ مصطفیٰ کمال نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد شیخ الاسلامی کے منصب کو ختم کر دیا، اور وزارتِ اوقاف کو (۲ مارچ ۱۹۲۴ء میں) توڑ کر اُسے وزارتِ تعلیم میں مدغم کر دیا۔ اور "مذہب کی نگرانی" کے لیے محکمہ امورِ دینی قائم کر دیا۔ مگر اس محکمہ کے ساتھ ترکی کی سیکولر حکومت نے عملاً ایسا برتاؤ کیا کہ وہ بالکل بے جان محکمہ بن کر رہ گیا۔ ۱۹۵۰ء تک مذہب پر ہر سُو خزاں کے بادل چھائے رہے۔ اس کے بعد سیاسی حالات میں جب تبدیلی کا آغاز ہوا تو معاشرتی زندگی بھی اس سے متاثر ہونے لگی اور ترک مسلمانوں نے اوّلین فرصت میں اپنے مذہب کی طرف دھیان دیا۔ اسی دور کی بات ہے کہ ۱۹۵۱ء میں "اشاعتِ علم" کے نام سے ایک انجمن کی تاسیس ہوئی۔ مدرسۂ امام و خطیب اسی رفاہی انجمن کی ایک کوشش ہے۔ ترکی میں احیائے اسلام کی موجودہ مساعی کے اندر انجمن اشاعتِ علم کا بھی قابلِ قدر کردار ہے۔

انجمن اشاعتِ علم اور اس کی خدمات ۶۸ ارکان سے انجمن اشاعتِ علم کا آغاز ہوا اور ایک غیر سیاسی ثقافتی اور رفاہی ادارے کی حیثیت سے اُس نے کام کی طرح ڈالی۔ اب اُس کے ارکان ہزاروں سے متجاوز ہیں اور ہر طبقے اور گروہ کی نمائندگی اسے حاصل ہے۔ سب سے پہلا کارنامہ اس انجمن کا یہ ہے کہ اس نے عوام کے چندے سے ایک شرعی مدرسے کی بنا ڈالی اور اب ترکی کے گوشے گوشے میں مدارس شرعیہ قائم ہو چکے ہیں[1] جنہیں مدارس امام و خطیب کہا جاتا ہے۔ خود انجمن کی اب ۲۰ سے زائد شاخیں ہیں اور بہت بڑا بجٹ اس کے تصرف میں ہے۔ اس کے صدر ایک پرانے فوجی کرنل جمال قرہ بکر ہیں۔ نائب صدر ایک وکیل ہیں۔ انتظامیہ کے ارکان میں زیادہ تر تعداد وکلاء اور انجینئر اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ہے۔ اس سے آپ اندازہ

---

[1] ان مدارس کی موجودہ تعداد ۷۰ ہے اور اس میں زیرِ تعلیم طلبہ کی کل تعداد ۴۲ ہزار ہے۔ ترکی کے اندر دینی تعلیم کے موجودہ نظام کا مفصل ذکر اگلی قسطوں میں آئے گا۔

کر سکتے ہیں کہ دین کے احیاء میں دلچسپی صرف قدیم طبقے کو ہی نہیں ہے بلکہ جدید طبقہ میں بھی اس کا شدید احساس ابھر رہا ہے۔

استنبول کے مدرسۂ امام و خطیب کا آغاز ۲۰ طلبہ سے ہوا اور اب ایک ہزار ۳ سو طلبہ تک تعداد جا پہنچی ہے۔ پہلے یہ ایک کرائے کی عمارت میں تھا اور اب جس وسیع و ضخیم عمارت میں ہے یہ اس کی اپنی ملکیت ہے اور ۲۰ لاکھ ترکی پونڈ سے تیار ہوئی ہے۔ پھر بھی ناکافی ہو رہی ہے۔ طلبہ کی رہائش کے لیے ۶۰ ہزار ترکی پونڈ کے سالانہ کرائے سے ایک اور ملحقہ عمارت حاصل کی جا چکی ہے۔ انجمن اسلامک انسٹی ٹیوٹ کے طلبہ اور یونیورسٹیوں کے دیگر طلبہ کی بھی امداد کرتی ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے انجمن نے ایک الگ ہوسٹل تعمیر کر دیا ہے جس کا رقبہ ۱۵ سو میٹر اور کل مصارف ۲۰ لاکھ ترکی پونڈ ہیں۔ مذہب، معاشرت، قانون اخلاق، ادب اور صنعت و زراعت کے میدان میں بھی انجمن کی قابلِ تعریف خدمات ہیں۔ معاشرتی امراض خصوصاً جوئے اور شراب کے خلاف انجمن نے آج کل خاصی زوردار مہم چلا رکھی ہے۔

روزنامہ بگُن اور اس کے ایڈیٹر مدرسۂ امام و خطیب سے فارغ ہو کر ہم روزنامہ بگُن کے دفتر میں گئے۔ بگُن کے ایڈیٹر جناب محمد شوکت ایلچی سے ملاقات ہوئی۔ موصوف روزنامہ بگُن کے ساتھ روزنامہ صباح بھی چلا رہے ہیں۔ دونوں کی اشاعت بہت وسیع ہے۔ صرف بگُن کی اشاعت ۸۰ ہزار ہے۔ نہ صرف ترکی بلکہ پورے یورپ کے صیہونی اور سامراجی حلقے بگُن پر سیخ پا ہو رہے ہیں۔ لندن کا مشہور یہودی پرچہ جیوش کرانیکل تو بار بار بگُن کے خلاف خطرے کی گھنٹی بجا رہا ہے۔ محمد شوکت ایلچی جواں سال اور جواں ہمت صحافی ہیں۔ انگریزی میں بات چیت کر لیتے ہیں۔ عربی سمجھتے ہیں بول نہیں سکتے۔ ترکی زبان کے آتش بیان ادیب ہیں۔ ترکی ملحد اور لادین طبقے اور دونما اور یہودیوں کے خلاف تند و تیز جنگ چھیڑ رکھی ہے۔ موصوف بڑے تپاک سے ملے۔ مولانا محترم کی خیریت دریافت کی اور واپسی پر مولانا کے پروگرام کی تفصیل پوچھی۔ پاکستان کے سیاسی مسائل، المیۂ فلسطین اور ترکی کی اسلامی تحریک کے موضوع پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ ان دنوں پاکستان میں شدید ہنگامے ہو رہے تھے۔ عرب اور مسلمان ممالک کے اکثر صحافیوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ پاکستان کے صحیح حالات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ سعودی عرب میں روزنامہ المدینہ کے سوا کسی پرچے کے اندر پاکستان

کے حالات کا صحیح تجزیہ نہیں دیکھا۔ مصری اخبارات نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ وہ پاکستانی خبروں کو اہمیت نہیں دیں گے۔ انہیں ہندوستان سے جو عشق ہے وہ پاکستان کی طرف اُن کو ملتفت نہیں ہونے دیتا۔ بیروت کا الحیاۃ پاکستان کی خبریں اندر کے صفحات میں شائع کرتا ہے مگر نہایت سطحی طور پر۔ پاکستانی سفارت خانے کی بدولت وہ پچھلے دس سال میں ایوب صاحب کی "حکومت راشدہ" کے قصیدے پڑھتا رہا ہے۔ جو لوگ فی الواقع پاکستان سے قلبی تعلق رکھتے ہیں وہ بھی پاکستانی سیاست کو ظاہری سطح سے آگے کچھ نہیں جانتے۔ ترکی کے دوسرے صحافیوں کا تو مجھے اندازہ نہیں ہے مگر بگُن کے ایڈیٹر محمد شوکت ایجی کو پاکستانی سیاست پر گہری نظر حاصل ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی اشتراکیت نوازی پر خوب روشنی ڈالی اور ان کے اس زمانے کے حالات سنائے جب وہ وزیر خارجہ تھے۔ یہاں تک کہہ گئے کہ پاکستان کے آنے والے دس سال اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ فری میسن اور یہودیوں کی بین الاقوامی سازشوں سے باخبر ہونے کی وجہ سے مجھے بار بار متوجہ کرتے رہے کہ پاکستان بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہیں ہے۔ بتانے لگے کہ ترکی میں خلافت کا خاتمہ اور لادینیت کا ظہور فری میسن اور یہودیوں کی دسیسہ کاریوں کا نتیجہ ہے۔ موصوف نے بتایا کہ جب سے میں نے ان دونوں کے خلاف آواز اٹھا رکھی ہے یہ مجھے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے قابو کرنے کے درپے ہیں۔ بلکہ یہودی تو مجھے کئی لاکھ کی رشوت پیش کر چکے ہیں تاکہ میں اُن کی سازشوں کو بے نقاب کرنے سے دستبردار ہو جاؤں۔ موصوف عربوں پر بہت برستے رہے اور اُن کی کوتاہ ہمتی، باہمی کشمکش، اخلاقی انحطاط اور خلافِ اسلام نظریات پر فریفتگی پر افسوس کا اظہار کرتے رہے۔

اسرائیل اور ترک مسلمان مسئلہ فلسطین کے بارے میں اس نوجوان ترک صحافی کے خیالات ملاحظہ ہوں۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے یوم فلسطین کے موقع پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کیا ہے:

"پچھلے سال اسی تاریخ کو اسرائیل نے نہایت وحشیانہ طریقے سے سرزمین عرب پر قبضہ کر لیا اور پرامن آبادی کے اندر اس نے قتل و غارت کا بازار گرم کیا اور ہزاروں باشندوں کو ظالمانہ طور پر ان کے گھروں سے نکال باہر کیا۔ اسرائیل کی یہ جارحانہ کارروائی اُن فراخدلانہ امدادوں کی بدولت عمل میں آئی ہے جو امریکہ، برطانیہ، فرانس اور مغربی جرمنی سے اُسے جدید ترین ہتھیاروں

اور ناپام بموں کی شکل میں مل رہی ہے"۔

"حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل آج صرف عرب ممالک کے لیے ہی ایک خطرہ نہیں ہے بلکہ اس کے تیور بتا رہے ہیں کہ وہ شرق اوسط کے پورے علاقے کے لیے جس میں خود ترکی بھی شامل ہے عظیم خطرہ بن رہا ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کی پیشانی پر یہ فقرہ لکھا ہوا ہے کہ "اسرائیل کی جغرافیائی حدود نیل سے فرات تک ہیں"۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ دریائے فرات جس کا نصف حصہ عرب کے اندر ہے اور نصف ترکی کے اندر، اسرائیل کی جوع الارضی کا ہدف ہے۔ اس حقیقت سے صیہونی پریس اور اس کے ہم سفر قطعاً انکار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ترکی کے بعض یہودی سرمایہ داروں نے ابھی سے شامی سرحدوں سے متصل علاقوں مثلاً مرسین، آدنہ اور اسکندرونہ کے اندر زمینیں خریدنی شروع کر دی ہیں اور وہاں کارخانے اور تجارتی مراکز کھولنے شروع کر دیئے ہیں کیونکہ یہ علاقے اسرائیل کی سرحدوں سے ملتے ہیں"۔

"یہ بات بڑی المناک ہے کہ بحر ابیض کے اندر یہودیوں کی دو بہت بڑی کالونیاں ہیں۔ ایک روشچائلڈ کی سرزمین فرانس اور دوسرے ترکی۔ ترکی میں ۴۵ ہزار یہودی ہم مسلمانوں کے بل بوتے پر جی رہے ہیں، اور خود ہمارا خون چوس رہے ہیں۔ ترکی کی فری میسن لاج، لائنز کلب اور روٹری کلب ان یہودیوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ یہ یہودی ہمارے ملک کی صحافت اور نشر و اشاعت کے وسائل و ذرائع کے واحد اجارہ دار بن کر بیٹھے ہوئے ہیں ترکی کے اخبارات نے (جنہیں بظاہر مسلمان چلا رہے ہیں) روزنامہ بگن کے سوا اسرائیل کے خلاف ایک سطر تک نہیں لکھی۔ حتیٰ کہ بعض اخبارات جو دائیں بازو کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں ان کی رگ ترکی کے مشہور یہودی سرمایہ داروں ماچو کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں کے بنک، درآمدی و برآمدی ادارے، اخبارات، نصابی کتابیں، انشورنس کمپنیاں تمام تر یہودیوں اور فری میسنریوں کے قبضہ میں ہیں۔ یہ وہ صورت حال ہے جو ترک مسلمانوں کو

ندامت اور شرمندگی سے پانی پانی ہو رہی ہے۔

"مزید برآں اسرائیلی جارحیت کسی معین حد تک جاکر رک جانے والی نہیں ہے یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم مملکت داؤد کو بحال کرنا چاہتے ہیں۔ جس کی حدود فرات سے نیل تک بتائی جاتی ہیں۔ گویا یہ مملکت ان مسلمانوں اور عربوں کو بے گھر کرکے وجود میں لائی جائے گی جو تیرہ سو سال سے وہاں آباد ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہودیوں کی یہ تمام کارروائیاں بین الاقوامی قزاقی سے عبارت ہیں۔"

"یہ صورت حال کب تک برداشت کی جائے گی؟ ترکوں کے دل اپنے عرب بھائیوں کے دوش بدوش دھڑک رہے ہیں۔ عرب ہمارے دینی بھائی ہیں بیت المقدس صرف عربوں کا شہر نہیں ہے بلکہ وہ تمام اسلامی دنیا کی میراث ہے۔ کامیابی کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور عربوں اور ترکوں کے اندر از سر نو اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا کی جائے۔ میں اپنے تمام دینی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ متحد ہو جائیں۔ ہم غصب شدہ علاقوں سے یہودیوں کو صرف اتحاد کے ذریعہ ہی نکال سکتے ہیں۔"

"اے ترک بھائیو! یہ نہ سمجھو کہ اسرائیل ہم سے بہت دور ہے۔ بلکہ وہ ہمارے بہت نزدیک ہے۔ وہ ہمارے اندر پھل پھول رہا ہے۔ وہ ہمارے مال لوٹ رہا ہے، ہمارا استحصال کر رہا ہے اور ہماری سرحدوں سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اسرائیل نے اب (خدانخواستہ) مدینۂ منورہ کی طرف بھی جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی تمام میدانوں میں اسرائیل کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیں۔ آج قلم اور زبان سے اس کے خلاف آغاز جنگ کر دیں اور کل ہتھیاروں کے ساتھ اس کے مقابلے میں ڈٹ جائیں یہاں تک کہ سلب شدہ علاقے آزاد ہو جائیں۔ اور ہمارا بیت المقدس ہمیں مل جائے۔ انشاء اللہ"

یہ اُس ترک صحافی کے جذبات وخیالات ہیں جس کے بھائی بند چند سال قبل قبرص کی جنگ میں اُن ہتھیاروں سے زخم کھا چکے ہیں جو مصر نے مکاریوس کو فراہم کیے تھے۔ ترکی کے ملاحدہ اور قوم پرست عربوں کے حق میں کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ یہ صرف عام مسلمان ہیں جو اسلامی اخوت اور اسلامی رشتہ کو ہر قیمت پر ترجیح دیتے ہیں۔ شریف حسین، غازی فیصل اور عرب قوم پرست اگر زندہ ہوتے تو وہ دیکھ لیتے کہ انگریزوں کی چالوں اور کرنل لارنس کے مشوروں نے جس قوم کے خلاف انہیں کھڑا کر دیا تھا وہ اس سزا کی مستحق نہ تھی کہ اس کے چند غلط اندیش لیڈروں کی نازیبا کارروائیوں سے بھڑک کر اُس قوم کی عورتوں اور بچوں کا قتلِ عام کیا جاتا، اس کی ٹرینوں کی ٹرینیں ڈائنامیٹ سے اڑا دی جاتیں اور صحراؤں کے اندر اُس کے گوشت کے ٹکڑے بکھیر دیے جاتے۔ مگر اب ترک مسلمان اس داستان سینہ فگار کو بھول جانا چاہتا ہے۔ عربوں کو بھی اب عقل کے ناخن لینے چاہئیں۔

مولانا محترم کا انتظار شوکت صاحب کے دفتر کی ہر چیز نہایت قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی تھی۔ باہر اگرچہ سردی انتہائی شدید تھی مگر دفتر کو اندر سے ہیٹروں نے خوب گرم کر رکھا تھا۔ بگُن اور صباح دونوں کا سٹاف نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ اس گفتگو میں سٹاف کے اور بھی متعدد ارکان شریک تھے۔ مولانا رومیؒ کی برسی اور مدرسہ امام وخطیب میں میری تقریروں کو بگُن نے صفحہ اوّل پر شائع کیا تھا؛ اور اب وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ مولانا محترم ترکی میں آئیں اور بگُن ان کی آمد پر خصوصی نمبر نکالے۔

اسلامی صحافت وقت کم ہو اور آرزوئیں لامحدود۔ ایسی صورت میں جو قلبی کیفیت ہوتی ہے وہی یہاں تھی۔ بے ربطی کے ساتھ بہت سی اِدھر اُدھر کی باتیں ہوگئیں۔ اصل چیز جس نے دل پر بے پناہ اثر چھوڑا وہ یہ تھا کہ اگر صحافت اور تعلیم کو نوجوان خون اسی طرح میسّر آتا رہا تو وہ دن دور نہیں کہ یہودی صحافت کی اجارہ داری ختم ہو جائے گی۔ ماضی قریب کی بات ہے کہ احمد امین یلمان کا وطن اخبار ترکی کی زبان سمجھا جاتا تھا حالانکہ احمد امین دونما گروہ سے تعلق رکھتا ہے، اور آج بھی روزنامہ جمہوریت اور حریت وغیرہ یہودی سرمائے کے شاخسانے ہیں۔ مگر عربی محاورہ کے مطابق انّ فی العرین اُسودا۔ اس کچھار میں اور شیر بھی ہیں۔ استنبول کا روزنامہ بگُن، روزنامہ صباح اور روزنامہ اتحاد اسلامی جریدے ہیں۔ اور ۶۰ اور ۸۰ ہزار کے درمیان ان

میں سے ہر ایک کی یومیہ اشاعت ہے۔ انقرہ کا ماہنامہ ہلال اور ماہنامہ حق سیسی (صدائے حق) اور ماہنامہ سوئمز (خاموش نہیں رہ سکتا) اور ماہنامہ الٰہی نور (نورِ خدا)، استنبول کا ماہنامہ اسلام مدنیت (تمدنِ اسلام) اور حرکت اور اسی طرح دوسرے ماہنامے کثیر تعداد میں چھپ رہے ہیں۔ اسلام پسند جوان امڈ امڈ کر صحافت کے میدان میں قدم رکھ رہے ہیں۔ عدالت پارٹی کے روزنامہ عدالت اور ایک آزاد اخبار ترجمان میں بھی اسلام پسند صحافیوں کو دخل حاصل ہے۔ نجیب فاضل کی نظمیں اور احمد قبقلی ایڈیٹر ترجمان کے غیر جانبدارانہ تبصرے ادبی و سیاسی زندگی پر خوب اثر انداز ہو رہے ہیں۔ بایں ہمہ پریس کی باگ ڈور ملاحدہ کے ہاتھ سے چھیننے کے لیے محنت، وقت اور قربانی کی وافر مقدار درکار ہے۔ ترکی کے ملحد پریس کو مغربی پریس کا تعاون حاصل ہے۔ خدا ترک مسلمان کو یہ ہمت دے کہ وہ اس دُہری جکڑ بندی سے نجات پا سکیں۔

دعاء اسلامی تحریکوں کا مشترک ہتھیار رخصت ہوتے وقت جناب محمد شوکت ایکچی نے راقم الحروف کو استاذ بدیع الزمان نورسی مرحوم کی مطبوعہ دعاؤں کے مجموعے کا ہدیہ پیش کیا۔ دعاؤں کی کتابوں سے مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ میرے پاس اخوان المسلمون کے بانی مرحوم حسن البنّا کا مرتب کردہ مجموعہ، سنوسی اعظم کا مجموعہ، عبدالعزیز بن سعود کی ادعیۂ مسنونہ کے مجموعے بھی موجود ہیں۔ اسلامی تحریک ان چیزوں سے کبھی بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ آنحضور کا فرمان مبارک ہے کہ الدعاء سلاح المومن (دعا مومن کا ہتھیار ہے) ترکی میں دعاؤں اور مناجاتوں کا بڑا رواج ہے۔ ہر نماز کے ساتھ لوگ پابندی سے کئی کئی دعائیں بآوازِ بلند پڑھتے ہیں۔ بدیع الزماں نورسی مرحوم کی دعاؤں کا مجموعہ جو کافی ضخیم ہے ایک طرف اللہ کی کبریائی اور قہاری و جبروت کے اعتراف سے بھرپور ہے اور دوسری طرف بندے کی بے بسی اور عجز و درماندگی کا صحیح نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ دعائیں بدیع الزماں مرحوم کے معمولات میں سے تھیں۔ ان دعاؤں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جادو اثر شخصیت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کس حد تک لگاؤ رکھتی تھی۔ مرحوم کے پیرو جنہیں طلبۂ نور کہا جاتا ہے۔ بالالتزام ان دعاؤں کو نماز پنجگانہ میں دہراتے ہیں۔ اور بڑے والہانہ انداز کے ساتھ ان کا ورد کرتے ہیں۔ ترکی کی اسلامی تحریک کا یہ پہلو مجھے بہت پسند آیا۔ اخوان المسلمون میں بھی "وردِ رابطہ" کے نام سے ایک دل گداز اجتماعی دعا کا رواج ہے اور وہ نماز مغرب سے پہلے یاد ہوتی کام پر نکلتے وقت پڑھتے ہیں۔ مگر ترکی کے طلبۂ نور کا یہ حال ہے کہ ہر شخص کی جیب میں یہ مجموعہ ہوتا ہے، سفر

میں ہو یا حضر میں جب اُسے تنہائی میسر آتی ہے تو وہ یہ مجموعہ کھول لیتا ہے۔

موئے مبارک کی زیارت | محمد شوکت صاحب سے اجازت لے کر ایک مسجد کا رُخ کیا تاکہ نماز عشاء اور نماز تراویح میں شمولیت کی جا سکے۔ نماز کے بعد میری انقرہ کو روانگی ہے۔ دوستوں نے ایک بس میں میری سیٹ بک کرالی ہے۔ ریل کے بجائے بس کا سفر ترک دوستوں کے مشورہ پر مبنی ہے۔ ان کی رائے ہے کہ چونکہ بسیں ایئر کنڈیشنڈ ہیں اس لیے رات آرام سے گزرے گی اور فجر کی اذان انقرہ میں سنی جا سکے گی۔ قریب ایک مسجد میں جسے جامع خوجہ پاشا کہتے ہیں داخل ہوئے تو مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھر رہی تھی۔ ہمیں دوسری منزل پر بمشکل جگہ مل سکی۔ رمضان المبارک ختم ہو رہا ہے۔ ہر برنا و پیر رمضان کو الوداع کرنے میں جذب و شوق سے حصہ لے رہا ہے۔ پاکستان کی طرح یہاں بھی کم عمر بچے رونق میں اضافہ کر رہے ہیں۔ مگر ان کی تربیت ایسی ہے کہ شور و غل نہیں مچاتے۔ بلکہ نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔ ساتھیوں کے بارے میں میرا خیال تھا کہ دن بھر کے تھکے ماندے عشاء کی نماز پر کفایت کریں گے اور تراویح کی بیس رکعت کی ہمت نہ پا سکیں گے۔ مگر انہوں نے خود بھی بیس رکعت تراویح ادا کی اور مجھے بھی حوصلہ ہو گیا۔ قاری صاحب کی تلاوت کے سوز اور پھر ہر چار رکعت پر نمازیوں کے باآواز بلند درود شریف پڑھنے نے شوق کو مہمیز لگائی۔ نماز تراویح کے بعد اعلان ہوا کہ "بال مبارک کی زیارت ہو گی"۔ عثمانی خلفاء کے عہد سے جو تبرکاتِ نبوی آستانہ میں موجود ہیں اُن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک بھی ہے۔ ہر سال رمضان المبارک کے عشرۂ آخر میں استنبول انقرہ اور دیگر بڑے بڑے شہروں میں موئے مبارک کی زیارت ہوتی ہے۔ حاضرین مسنون درود شریف پڑھتے جاتے تھے اور باری باری امام صاحب کے ہاتھ سے موئے مبارک کو بوسہ دیتے جاتے تھے۔ صحت و عدم صحت سے قطع نظر موئے مبارک سے حاضرین کی محبت و عشق کا منظر دیدنی تھا۔

انقرہ کی طرف | ہم ہوٹل آ کر سامان لیا اور اتمت کمپنی کی بس کے دفتر میں آ گئے۔ ہوٹل میں منیجر صاحب سے جب ہوٹل کا بل طلب کیا تو انہوں نے یکایک یہ انکشاف کیا کہ "گُن" کے ایڈیٹر محمد شوکت ایجی صاحب کی طرف سے بل ادا کر دیا گیا ہے۔ اور جب بس کا ٹکٹ خریدنے لگا تو معلوم ہوا کہ گذشتہ رات مدرسۂ امام و خطیب میں اسماعیل دائے نامی جن صاحب سے کتابوں کی نشر و اشاعت کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی تھی وہ میرے

لیے ٹکٹ خرید چکے ہیں۔ استنبول میں راقم الحروف کے یہ دو دن بھرپور گزرے ہیں۔ شہر کی سیاحت بھی کی ہے۔ بعض قابل دید مقامات بھی دیکھے ہیں۔ مگر استنبول نے مجھے ایک ترکی لیرہ بھی خرچ کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ہوائی اڈہ سے عمر ہوٹل تک ٹیکسی والے نے چند لیرے لیے۔ اس کے بعد عبدالقادر سیزگین نے محبت کی ایسی طرح ڈالی کہ استنبول سے انقرہ روانہ ہوتے وقت تک تبرّکاً بھی ہاتھ جیب تک نہ جا سکے۔ "انقرہ سے واپس استنبول آؤں گا" یہ جملہ بار بار زبان پر آجاتا۔ دل کی خواہش بھی یہ تھی اور دوستوں کا تقاضا بھی۔ مگر اس کے باوجود استنبول کی مفارقت گراں گزر رہی تھی۔ بڑی دل گرفتگی کے عالم میں "اتمت بس" میں سوار ہوا۔ اور جب تک بس نے حرکت نہیں کر لی نائف آفندی، پروفیسر عزیز، استاد یوسف، عبدالقادر سیزگین اور دوتین اور اصحاب مجھ سے جدا نہ ہوئے۔ (باقی)

مطبُوعات

حیات سید احمد شہید | تالیف - مولانا محمد جعفر تھانیسری. شائع کردہ نفیس اکیڈمی، بلاسس اسٹریٹ کراچی ۱ء
قیمت ۱۲ روپے صفحات ۳۹۶

اخلاقی اقدار کی سربلندی کے لیے جو تحریکیں اٹھتی ہیں، ان کے علمبرداروں کی نیکی اور پرہیزگاری اور ان کے سربراہوں کی روحانی عظمت اور سیرت و کردار کی پختگی کا اگر قریب کے زمانے کی کسی تحریک سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو وہ تحریک مجاہدین ہے۔ یہ کتاب اس تحریک کے ایک عظیم رہنما کی سوانح حیات ہے جسے ان کے ایک نامور رفیق کار نے قلمبند کیا ہے۔ کتاب گو تاریخی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے مگر تبصرہ نگار کے خیال کے مطابق اگر اُسے تنقیح، نئی ترتیب اور حواشی کے ساتھ شائع کیا جاتا تو یہ زیادہ مناسب ہوتا۔ اس میں کئی ایک باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محلِ نظر ہیں۔ پھر اس میں لکھنے والے کے ذاتی تاثرات اور رجحانات بھی شامل ہو گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ناشر آئندہ ایڈیشن ہماری ان گزارشات پر غور کرنے کے بعد ہی شائع کریں گے۔

اُلٹے بانس بریلی کو | تالیف - مولانا رائے محمد احمد خاں. شائع کردہ، ہیروز اکیڈمی ہیلپز کالونی اے۔ لائلپور
قیمت ایک روپیہ صفحات ۱۱۷

تنگ نظری، بغض اور فرقہ بندی کی موجودہ فضا میں جب بھی وسعت نظر، انصاف پسندی اور امت کے اندر اتحاد و اتفاق کی جھلک نظر آتی ہے تو طبیعت کو گوناگوں راحت ملتی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے مطالعے سے بھی قلب و دماغ کو اس بات کا اطمینان حاصل ہوا ہے کہ امّت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حق گوئی کی جرأت رکھتے ہیں۔ کتاب کے مصنف کا تعلق بریلوی مکتب فکر سے ہے۔ مگر انہوں نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے مسلک کے ان حضرات سے شدید اختلاف کیا ہے جو شاہ اسماعیل شہیدؒ اور اکابر دیوبند پر کفر کے

فتوے لگاتے ہیں یہ ایک مستحسن قدم ہے۔

فاضل مصنف نے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کو بڑی عجلت میں لکھا۔ اُن کی خدمت میں ہم یہی گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ ازسرِنو مرتب کریں اور اسے اچھے طباعتی معیار پر شائع کروائیں۔

نظریہ پاکستان اور اسلامی آئیڈیولوجی | تالیف جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب۔ مطبوعات نوری، لیاقت آباد، کراچی، پاکستان۔

کتاب کے فاضل مصنف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ زیرِ تبصرہ مقالے میں انھوں نے دلائل کے ساتھ اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ نظریہ پاکستان کے پیچھے احیائے اسلام کا مقدس جذبہ کارفرما ہے اور پاکستان میں اسلامی نظام حیات کے علاوہ اور کوئی دوسرا نظام حیات کامیابی کے ساتھ نہیں اپنایا جاسکتا ہے۔ یہ مقالہ بڑا فاضلانہ ہے۔ مصنف کے وسعت مطالعہ اور فکری گہرائی کا آئینہ دار ہے۔

ناشرین نے اسے نہایت اونچے طباعتی معیار کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس ملک کے سارے سنجیدہ طبقوں خصوصاً نوجوانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

صحیفہ غالب۔ حصہ اوّل و دوم | زیرِ ادارت: ڈاکٹر وحید قریشی صاحب۔ مقام اشاعت، مجلس ترقی ادب، ۲ کلب روڈ، لاہور۔ قیمت دس روپے۔ صفحات جلد اوّل ۵۰۰، جلد دوم ۱۳۰۔

غالب کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر پاک و ہند کے متعدد جرائد نے غالب نمبر شائع کیے ہیں۔ زیرِ نظر نمبر بھی اسی سلسلے کی ایک قابل قدر کوشش ہے۔ جسے اس کے فاضل مدیر نے بڑی کاوش اور دیدہ وری سے مرتب کیا ہے۔ اس بزم غالب میں پاک و ہند کے قریب قریب سارے معروف لکھنے والے شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے غالب کی شخصیت اور اس کے فن کا نہایت سلجھے ہوئے انداز میں جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کے لیے ستائش کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالب کے بارے میں نہایت

قابلِ اعتماد علمی مواد جمع کر دیا ہے۔ یوں تو اس نمبر کے سارے مقالات وقیع ہیں مگر چند ایک تو خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔

مثلاً حصہ اوّل میں غالب کی تاریخ گوئی، مرزا غالب کا اسلوبِ نگارش، محاسن خطوطِ غالب اور حصہ دوم میں، غالب کی شاعری میں تسکین ضمیر، غالب بٹی ہوئی شخصیت کا مسئلہ، غالب اور خودداری۔ غالب کا شعور کائنات، غالب اور شعورِ حیات، کلام غالب میں طنز و ظرافت۔

یہ مجلہ نہایت اونچے طباعتی معیار کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا گیا ہے۔

مقامِ غالب | تالیف جناب عبدالصمد صارم الازہری۔ ناشر ادارہ علمیہ ۵ دھنی رام روڈ، نئی انار کلی، لاہور۔ قیمت چھ روپے۔

اس کتاب میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کلامِ غالب زبان و بیان کی خوبیوں سے یکسر عاری ہے اور وہ قواعد کے اعتبار سے بھی درست نہیں۔ اس بنا پر مرزا غالب اپنے معاصرین میں سب سے کم درجے کے شاعر ہیں اور انہیں زبان و فن کے معاملے میں کسی طرح بھی سند نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کتاب میں کتابت و املا کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔ معیار طباعت گوارا ہے۔

تحریکِ اسلامی اور اس کے مخالفین | تالیف۔ جناب محمد یعقوب طاہر صاحب۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ محمدیہ چاہ ٹوٹیانوالہ گرجاکھ، گوجرانوالہ۔ قیمت ساڑھے چھ روپے صفحات ۴۰۸

زیر تبصرہ کتاب میں جناب یعقوب طاہر صاحب نے تحریک اسلامی کے مخالفین اور بے رحم ناقدین کے الزامات کا جائزہ لیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ ان حضرات کی الزام تراشیاں کس قدر بے بنیاد ہیں۔ فاضل مصنف نے مواد کو بڑی عرق ریزی سے جمع کیا ہے اور اچھے انداز میں ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے جہاں جماعت اسلامی کے ناقدین کی بے انصافیاں سامنے آتی ہیں وہاں جماعت اسلامی کے موقف کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے اگرچہ اظہار خیال میں احتیاط سے کام لیا ہے مگر تبصرہ نگار کے نزدیک اس احتیاط کے باوجود کہیں کہیں ان کے لہجہ میں تلخی آگئی ہے ۔

بائیبل سے قرآن تک (جلد اوّل) تالیف ۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ۔ ترجمہ ۔ مولانا اکبر علی صاحب ۔ شائع کردہ ، مکتبہ دار العلوم کراچی نمبر ۱۴ ۔ صفحات ۶۱۴ ۔ قیمت ۱۵ روپے ۔

زیر تبصرہ کتاب مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی مرحوم و مغفور کی معروف کتاب ' اظہار الحق ' کا اردو ترجمہ ہے ۔ یہ آج سے قریب قریب ایک صدی پیشتر شائع ہوئی اور اس نے دنیا کے سارے علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا ۔ خود عیسائی اس کی اشاعت سے اس قدر بوکھلائے کہ جب اس کا انگریزی ترجمہ لندن پہنچا تو ٹائمز نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا " لوگ اگر اس کتاب کو پڑھتے رہے تو دنیا میں مسیحیت کی ترقی رُک جائے گی "۔ مصر کے جیّد اور نامور علماء نے اس کی بے حد تعریف کی اور یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے عیسائیت کی تردید میں جو کتب مرتب کی ہیں یا جو مقالات لکھے ہیں اُن میں یہ کتاب نمایاں حیثیت رکھتی ہے ۔ مولانا مرحوم نے اس کتاب میں جو دلائل دیے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہیں ۔

یہ کتاب اُن پانچ مسائل کی تنقیح اور تشریح پر مشتمل ہے جن پر مولانا مرحوم اور پادری فانڈر صاحب کے درمیان آگرہ میں تاریخی مناظرہ ہوا اور جس میں پادری صاحب کو شکست فاش ہوئی ۔ وہ پانچ مسائل یہ ہیں تحریف بائبل ، وقوع نسخ ، تثلیث ، رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حقانیت قرآن ۔

موجودہ حالات میں جب مسیحی سرگرمیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں اس بات کی ضرورت تھی کہ عیسائیت کے ردّ میں کوئی اونچی کتاب شائع کی جائے ۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کو باری تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت کا اپنی نگرانی میں التزام فرمایا اور اس کے ترجمے اور ترتیب کا کام ان اصحاب کے سپرد کیا جو ہر لحاظ سے اس کے اہل ہیں ۔ مولانا اکبر علی صاحب نے اسے نہایت اچھے انداز میں اردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور مفتی صاحب کے فرزند ارجمند مولانا محمد تقی عثمانی صاحب نے اسے بڑے سلیقے کے ساتھ از سرِ نو مرتب کیا ہے اور آغاز میں عیسائیت کے بارے میں اور مولانا مرحوم

کی تبلیغی اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے متعلق ایک جامع مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ کتاب کا معیار طباعت و کتابت عمدہ ہے۔

کتاب التوحید | تالیف شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ۔ مترجم مولانا ابوعبداللہ محمد بن یوسف۔ ناشران: نور محمد کارخانۂ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ کراچی۔ صفحات ۲۲۲، قیمت ۱/۲ روپے پچاس پیسے۔

قریب کے دور میں امت کے جن مصلحین نے مسلمانوں کے اندر پھیلے ہوئے مشرکانہ خیالات اور اعمال کی اصلاح کی کوششیں کیں۔ اُن میں نجد کے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآن و احادیث نبوی سے توحید کی حقیقت، اس کے حدود، شرک کی مختلف نوعیتوں کی وضاحت کی ہے اور بتایا ہے کہ شرک انسان کو کن کن گمراہیوں میں مبتلا کرتا ہے۔ توحید اسلام کا اساسی عقیدہ ہے۔ اور اس کا نقش دلوں میں بٹھانے کے لیے جو کوشش بھی کی جائے وہ قابلِ قدر ہے۔

کتاب کا معیار طباعت گوارا ہے۔

عبرت کدۂ سندھ | تالیف۔ ڈری یوز فرم ینگ ایجپٹ۔ مترجم۔ جناب سید محمد ضامن کنتوری۔ شائع کردہ نفیس اکیڈیمی۔ بلاسس اسٹریٹ کراچی نمبرا۔ قیمت مجلد بارہ روپے۔ صفحات ۳۹۸

ڈری یوز فرم ینگ ایجپٹ کا یہ سفرنامہ سندھ آج سے قریب قریب سوا سو سال پیشتر شائع ہوا تھا۔ یہ سفرنامہ مصنف نے ہمدردانہ جذبات کے ساتھ لکھا ہے اور اس میں ان مظالم کا ذکر کیا ہے جو سر چارلس نیپئر نے والیانِ خیرپور اور امیرانِ حیدرآباد پر ڈھائے تھے۔ اس میں سندھ پر انگریزی سپاہ کی یلغار اور اُمرائے سندھ کی دفاعی کوششوں کا بھی تذکرہ ہے۔

کتاب کا مصنف انگریز ہونے کے باوجود انسانی جذبات سے یکسر عاری معلوم نہیں ہوتا اور اس نے اپنی قوم کی چیرہ دستیوں کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ اور امیرانِ سندھ کو اپنے ظلم کا تختۂ مشق بنانے کے لیے جو اخلاقی الزامات اُن پر عائد کیے تھے، ان کی بھی تردید کی ہے۔ اس یادداشت کا اردو ترجمہ ۱۹۰۲ء میں

جناب ضامن کنتوری نے کیا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ پیشتر کا یہ ترجمہ آج بھی شگفتہ اور موثر معلوم ہوتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب ایک نہایت بیش قیمت تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعہ سے انگریزی قوم کے مظالم اور اس کی ریشہ دوانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے اُبھر آتا ہے۔ نفیس اکیڈیمی نے اسے شائع کر کے ایک اہم خدمت سرانجام دی ہے۔ کتاب کی قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

مقابل ہے آئینہ | تالیف۔ الطاف حسن قریشی۔ شائع کردہ، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، سمن آباد۔ لاہور۔ قیمت ۷۵ر۷ روپے۔ صفحات۔ ۱۲۳

اردو ڈائجسٹ کے فاضل مدیر نے مختلف اوقات میں ملک کی جن اہم شخصیتوں سے جو انٹرویو لیے ہیں، اُن میں سے پانچ نامور حضرات کے انٹرویو کو زیر تبصرہ کتاب میں شائع کر دیا ہے۔ ان حضرات میں جسٹس حمود الرحمن، جناب ذوالفقار علی بھٹو، ایر مارشل اصغر خان، جسٹس محبوب مرشد اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی شامل ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایک طرف تو ان حضرات کی زندگیوں کے خطوط اُبھر کر سامنے آتے ہیں اور دوسری طرف اُن کے اندازِ فکر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

کتاب کا معیار طباعت اور کتابت کافی اونچا ہے۔

مختصر شعب الایمان | تالیف۔ شیخ امام ابوجعفر عمر قزوینیؒ۔ ناشر۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ کراچی۔ قیمت۔ ایک روپیہ پچاس پیسے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ اور بعض روایات میں کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔ سب سے اعلیٰ اور افضل شاخ توحید باری تعالیٰ عزّ اللہ یعنی لاالہ الا اللہ کہنا اور سب سے ادنیٰ ایذا رساں چیزوں کا راستہ سے ہٹانا ہے اور حیاء شرم بھی ایمان کی شاخ ہے۔"

امام بیہقی نے اپنی مشہور کتاب شعب الایمان میں مندرجہ بالا حدیث کی صراحت میں ایمان کی ۷۷ شاخوں کو بڑی تفصیل سے جمع کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب اس کا اختصار ہے۔ اس کا مطالعہ ایمان کو جِلا دینے اور تزکیہ نفس کے لیے بہت مفید ہے۔

ترقی اور افلاس | تالیف سید صدیق الحسن گیلانی، ایم، اے۔ شائع کردہ۔ ایوان ادب۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن تین روپے، ادنیٰ ایڈیشن۔ دو روپے۔ صفحات ۱۴۴

پاکستان کی معاشی ترقی کے چرچے تو بہت ہیں مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر اس ترقی کے ثمرات سے کون خوش نصیب بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ عوام کے اندر تو اس ترقی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ بلکہ اُن پر تو زندگی عذاب بن کر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ جناب سید صدیق الحسن گیلانی نے اس راز سے پردہ اُٹھایا ہے بلکہ فساد کے اصل مرکز کی نشاندہی کی ہے۔ فاضل مصنف کو اللہ تعالیٰ نے مومنانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ حقائق کا صحیح فہم و شعور بھی عطا کیا ہے۔ انھوں نے غیر معمولی ذہانت کے ساتھ ان اسباب کا کھوج لگایا ہے جن کی دراز دستیوں نے عوام کو ترقی کے ثمرات سے یکسر محروم رکھا ہے۔

اس کتاب میں ملکی حالات کا جو جائزہ لیا گیا ہے وہ بڑا حقیقت پسندانہ اور فاضلانہ ہے اور اس میں نہایت قابلِ قدر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

فاضل مصنف پوری پاکستانی قوم کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں سے عوام کو پوری طرح آگاہ کیا ہے۔ اس ملک کے تمام پڑھے لکھے افراد کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کتاب کا معیار طباعت و کتابت عمدہ ہے۔ اور قیمت بھی بالکل مناسب ہے۔
